اُس بازار میں

شورش کاشمیری

مکتبہ چٹان، لاہور

بار سوم
ایک ہزار

قیمت :- چار روپے

ناشر :- مکتبۂ چٹان، لاہور

طابع :- اردو پریس، لاہور

آہ! میرے پاس طاقت ہوتی تو میں اس کتاب کو نہ لکھتا بلکہ اس معاشرہ کے در و دیوار ہلا ڈالتا جس میں عورت کسبی ہے۔ میرے پاس تلوار ہوتی تو سیاسی کھوپڑیوں کی فصل کاٹتا کہ پک چکی ہے۔ میرے پاس صرف قلم ہے اور میں نے اس عورت کے زخم پیش کئے ہیں جس کا روپ عیاش انسانوں کے قہقہوں کی دستبرد میں ہے۔

کاش! مجھے اختیار ہوتا کہ میں بڑے بڑے عماموں کے پیچ کھولتا، ان کی دستارِ فضیلت کے پھریرے بنا کر بالا خانوں پر لہراتا عالمگیری مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو کر فقیہ شہر کو للکارتا اس کی دراز قبا کو پھاڑ ڈالتا اور اس کے ٹکڑے دریدہ عفتوں کے حوالے کرتا کہ اس سے اپنی برہنگی کو ڈھانپ لیں، یہ قبا نہیں، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا کا کفن ہے۔

شورش کاشمیری

کوئی شخص اس کے مطالعہ سے گمراہ ہوتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ
اس نے میری کتاب کا مقصد کھو دیا ہے، کوئی راہ پر آتا ہے تو
مجھے خوشی ہو گی کہ اس کے نفس کی نیکی جاگ اٹھی ہے۔ اس کے علاوہ
نہ مجھے داد و تحسین کی ضرورت ہے کہ اس جنس کا سد سے میرا
جی بھر چکا ہے، نہ فقیہوں کی ملامت، معلموں کے قہر، اور
راہنماؤں کی خشونت سے ڈرتا ہوں کہ اس سے زیادہ بے مایہ چیز
اس کرۂ ارضی پہ کوئی نہیں ہے

شورش کاشمیری

ایک تعارف

(عبدالمجید سالک)

عورت کی جسم فروشی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کرۂ ارضی پر سب سے پہلی جنس جو بیچی گئی اور خریدی گئی یہی جنس ہے۔

ابتدائے آفرینش کے پہلے مردوں میں سے کسی نے کسی عورت سے متمتع ہونے کے لیے کسی پھل یا پھول یا کسی اور خوش ذائقہ فریب یا دیدہ زیب چیز سے عورت کو لبھایا ہو گا۔ اور عورت نے اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ہو گا۔ بس یہیں سے جسم فروشی کی بنیاد پڑی یعنی حرص اور احتیاج نے اس پیشے کو جنم دیا۔ اسی چیز نے آگے چل کر ازدواج اور اس کی مختلف صورتوں میں ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ لیکن یہ بحث

میرے موضوع سے خارج ہے۔

ابتدائی مذاہب سے جنس کا تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ مذہب اور جنس دونوں جذبات ہی کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ یونان کے اپیکورس، بھارت کے بلبھ سوامی اور وام مارگی فرقے کے لوگوں نے استلذاذِ جنسی ہی کو شکرِ نعمت اور عبادت قرار دیا۔ اور جب مذہب میں تصوف کا عنصر شامل ہوا تو اس کا تعلق "جنس" کے ساتھ اور بھی واضح ہو گیا۔ اور "ہمہ اوست" کے پردے میں خدا جانے جنس کی کیا کیا صورتیں جواز حاصل کر گئیں۔ اسلام نے ——— دیو داسیوں کا ادارہ تو پیدا نہ ہونے دیا لیکن حضرت داتا گنج بخش، حضرت معین الدین اجمیری، حضرت صابر کلیری، شاہ بری لطیف اور دوسرے صوفیہ کے مزاروں پر طوائفوں کا رقص و سرود اسلام کے اخلاقِ عالیہ کے باوجود اب تک جاری ہے۔

• • •

اسلام نے جنس کے متعلق نہایت دانشمند رویہ اختیار کیا۔ اس نے تقاضائے جنسی کی فطری حیثیت کو تسلیم کیا۔ تعددِ ازدواج کی اجازت دی۔ لونڈیوں سے تمتع کی گنجائش بھی پیدا کی طلاق کو بھی آسان کر دیا۔ اور ان تمام رخصتوں اور اجازتوں کے بعد زنا کی سزا کی سختی طبعی و قدرتی تھی۔ اسلام طوائفیت کا سخت دشمن ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ فتنہ احتیاج سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے زیادہ سے زیادہ عورتوں کو شرفاء کے گھروں کی چھت کے نیچے پناہ دینے کا انتظام کر دیا تاکہ کوئی عورت معاشی احتیاج سے مجبور ہو کر عصمت فروشی اختیار نہ کرے۔

طوائفیت انسان کے زمانۂ جاہلیت کا ادارہ ہے جیسے شراب قدیم الایام سے چلی آتی ہے۔ اسلام نے دونوں کو ناجائز قرار دیا۔ لیکن جس طرح شراب اس کے باوجود اب تک پی جاتی ہے اسی طرح طوائفیت بھی جاری ہے۔ تاہم ان امور میں اسلام کی سعیِ اصلاح کے نتائج نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ تاریخ اسلام کے جن سلاطین و اُمراء نے ان عیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے افعال کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہے۔

• • •

شورش کی یہ کتاب بہت سے حلقوں کو چونکا دینے والی ثابت ہو گی۔ مذہبی رجحان کے لوگ اس پر یونہی ناک بھوں چڑھائیں گے۔ جیسے ہر حقیقت کے اظہار پر ان کی عادت ہے۔ اخلاق کے علمبردار کہیں گے کہ اس کتاب کا اثر اخلاقِ عامہ پر اچھا نہ ہو گا۔ گو ان کے اس دعوے کی دلیل کوئی نہ ہو گی۔ اربابِ حکومت ان انکشافات کو اپنی بے تدبیری۔ بے حسی یا بے بسی پر حملہ سمجھیں گے۔ لیکن اہلِ فکر اس کتاب کو پڑھ کر سوچ میں پڑ جائیں گے کہ آخر طوائف کے ادارے کو کیا کیا جائے۔ اسے باقی رکھا جائے تو کیا حدود قائم کی جائیں کہ جواز اور افادے کی صورت نکل آئے۔ اور اگر اسے موقوف کیا جائے تو کیونکر۔ اور اس موقوفی کے نتائج کا مداوا کیا ہو۔ عمرانیات کے طالب علم وا‌ئے زنی کریں گے کہ اس ادارے کا وجود کیوں ہے اور کون سے معاشی و عمرانی عوامل کو بروئے کار لانے سے یہ ادارہ نابود کیا جا سکتا ہے۔

شورش نے اپنے قول کے مطابق "چھ سو لڑکیوں" کے حالات معلوم کر کے جو تجزیہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ہمارے معاشرے کے لیے لعنت ہے۔ لیکن یہ لعنت بھی معاشرے ہی کی خرابیوں کی شرمندۂ احسان ہے ــــ خدا کرے داناؤں کا یہ قول غلط ثابت ہو کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ ورنہ معاشرے کو یہ گھن آہستہ آہستہ ختم کر دے گا ــــ شورش کے نزدیک غربت، بے وفائی، معاشرتی خرابی، فحش ادب، آزادہ روی، شوق، تفریح وغیرہ اس ادارے کے قیام کے اسباب ہیں۔ لیکن اصل مرکزی نقطہ یہی ہے کہ ہمارے نظامِ حیات کی اقتصادی اور معاشرتی چولیں بالکل ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ جب تک یہ نظام نہ بدلے گا عصمت فروشی بند نہ ہوگی۔ اللہ اور رسولؐ کے احکام بہت سنائے جا چکے، اخلاق کے وعظ بہت ہو چکے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور بعض اہلِ فکر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اسلام بھی اپنی تعلیمِ اخلاق میں محض اسی لئے کامیاب ہوا تھا کہ اس نے معاشرے کو اقتصادی اور معاشرتی نابرابری سے پاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسلام نے منہیات پر سخت زجر و توبیخ اور تخویف و ترہیب روا رکھی۔ اس کا مخاطب وہی پاک شدہ نظامِ معاشرت تھا۔ معاشرے کو انتہائی ثروت اور انتہائی ناداری میں تقسیم کر دینا اور ہر طرف آزادگی و اباحت کی فضا پیدا کر دینا اور اس کے بعد توقع رکھنا کہ لوگ احکامِ اسلامی کی تعمیل میں منہیات سے مجتنب رہیں گے۔ بہت بڑی زبردستی ہے ــــ!

• • •
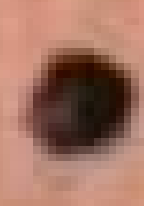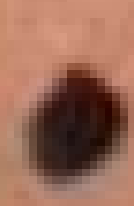
شورش نے اس کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں عصمت فروشی اور طوائفیت اور جنس پرستی کی جو تاریخ بیان کی ہے۔ اس سے ہر شخص اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس ادارے کو ابتدائی زمانوں میں مذہب کی اور بعد کے ادوار میں سلاطین و امرا کی سرپرستی حاصل رہی۔ اور انہی کی فحش نوازیوں نے اس کو دوام بخشا ــــ آج بھی بالکل یہی کیفیت ہے ــــ تصوف کی بعض محفلوں میں "شمع مجلس" مجرا کرنے والی طوائفوں کو عطیات سے نوازتے ہیں۔ اور سرمایہ داروں کی دولت تو شب و روز ہی ان پر نچھاور ہوتی ہے۔

پھر ٹبی اور بازار شیخو پوریاں اور ہیرا منڈی کے متعلق تفصیلات اپنا ماجرا خود ہی بیان کر رہی ہیں کسی تعارف و تشریح کی ضرورت نہیں ــــ؟

طوائفوں کا ایک بیان تو یہ ہے کہ ان کا مذہب پیسہ ہے اور دوسرا یہ کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتی ہیں۔ پیروں کی نذر نیاز دیتی ہیں ــــ یعنی طوائف آج تک اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ اس کے سر پر سرمائے اور مذہب دونوں کا چتر عاطفت سایہ فگن ہے۔

• • •

شورش کے دلفریب انداز تحریر کی بجا ذہین اور شوخیاں اس وقت درجۂ کمال کو پہنچتی ہیں جب وہ ٹکیائیوں کی داستان سے نکل کر ڈیرے داریوں کے تذکرۂ جمیل کی طرف عناں تاب ہوتا ہے۔ لیکن خورشید اور نیلم کے بیانات میں جو نظریت اور حقیقت ہے۔ جو سادگی اور سلاست ہے۔ جو خلوص اور صداقت

ہے وہ ڈیرے داریوں کے ذکر و فکر میں مفقود ہے۔ صرف شمشاد، امتیاز، ممتاز اور
شہناز ہی کو مصنف نے طباعی، تفلسف، ادب اور تفنن کے پیکر ہائے حسین میں
ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ڈیرے داریوں کی صحبت کی طفیل سے محمد دین
تانگے والا، حمزی طبلے والا، مائی وزیر بلکہ شوکت بیہرا تک حقائقِ حیات کا وہ علم اور
ان کے اظہار کا وہ ملکہ رکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے فلسفیوں اور ادیبوں کو نصیب
نہیں ——— پھر مختار نے تو علمِ موسیقی کے متعلق معلومات کے وہ دریا بہائے ہیں
کہ مختار تو مختار آغا حشر کو بھی میسر نہ ہوں گے۔

خدا جانے یہ مصنف کے کمالِ انشا اور مہارتِ تحریر کا کرشمہ ہے یا آج کل
ٹبی سچ مچ ہی غرناطہ و بغداد کی جانشین بن رہی ہے کہ اس میں ایسے ایسے حکیم، کلیم،
ادیب اور مغنی جمع ہو رہے ہیں ———،

• • •

بہت سے لوگوں کو احساس ہو گا کہ شورش قدردانیٔ فن کی لہر میں "ایک خاص
خاندان" کا پروپیگنڈا کرنے کے الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا ——— ممتاز
بہت ہی ذہین و طباع ڈکی سہی لیکن شورش کی قلم کاری نے اسے بہت بلندیوں
تک پہنچا دیا ہے ——— اور شہناز کتنی ہی عالم فریب رقاصہ سہی لیکن خدا شورش
کے قلم سے "ادبیت کا اسراف" ملاحظہ ہو ———،

اس کا ناچ تیز ہوتا گیا۔ اس کی دھنیں چھلتی گئیں۔ اس کے چہرے کا

رنگ سُرخ ہو گیا۔ اس کی ادائیں نکھرتی گئیں۔ اس کے پھول کھلتے گئے۔ اس کے شعلے ٹوٹتے گئے۔ اس کا روپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا۔ کبھی لہروں کی طرح بڑھی۔ کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی۔ کبھی خوشبو کی طرح پھیلی۔ کبھی بجلی کی طرح کوندی۔ کبھی مینا کی طرح چھلکی۔ کبھی ساغر کی طرح کھنکی۔ کبھی گلاب کی طرح مہکی۔ کبھی بلبل کی طرح چہکی۔ کبھی گھٹاؤں کی طرح اٹھی۔ کبھی میکدے کو نکل گئی۔ کبھی تبکدے کو آ گئی۔ کبھی آغوش بن گئی۔ کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی ——— لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی اس کا ہر ادا یہ سوال بنتا گیا۔ فرشتوں کا زہر خند ——— قدرت کا نوحہ ———"

میرے نزدیک یہ زیادہ تر شورش کا حُسنِ نظر ہی ہے کہ اسے شہنازؔ "رقاصۂ فلک" یا "آکاش کی اپسرا" بن کر نظر آئی اور شورش کا توازنِ تحریر اس کے فنِ رقص کی موجوں میں تنکا بن کر بہ گیا۔

کتاب کا مجموعی اثر یہ ہے کہ فحش کا پیشہ نہایت نفرت انگیز ہے، فحش کی گلیاں نہایت غلیظ ہیں۔ فحش کے کاروباری نہایت مکروہ اور گندے ہیں۔ اور یہ ادارہ ہمارے معاشرے کے چہرے پر کوڑھ کے زخم سے کم نہیں ——— لیکن رقص و موسیقی فنونِ لطیفہ ہیں اور جو عورتیں اس فن میں کمال پیدا کرتی ہیں اور لطیفہ سنجی اور حاضر جوابی میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ وہ پسندیدہ ہیں قابلِ قدر ہیں۔ مستحقِ محبت ہیں ——— لیکن شورش نے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ "فنونِ لطیفہ

"عالیہ رقص و موسیقی" کے کمالات نے جسم فروشی کی لعنت سے اب تک کیوں نجات حاصل نہیں کی اور اعلیٰ درجے کی مغنیہ و رقاصہ کے لیے زانیہ ہونا کیوں ضروری ٹھیر گیا۔

بہرکیف یہ کتاب شورش کے البیلے اندازِ تحریر۔ اس کے حُسنِ تخیل اور اس کی لطافتِ ذوق کا مرقع ہے۔ ہماری زبان میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں۔ جن میں حُسنِ ظاہری اور جمالِ باطنی کو اس طرح جمع کیا گیا ہو ــــ میں اس کتاب کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں ــــ،

عبدالمجید سالک

کراچی

حرفِ آغاز ———

حنائی زنجیریں

ایک عظیم کنایہ
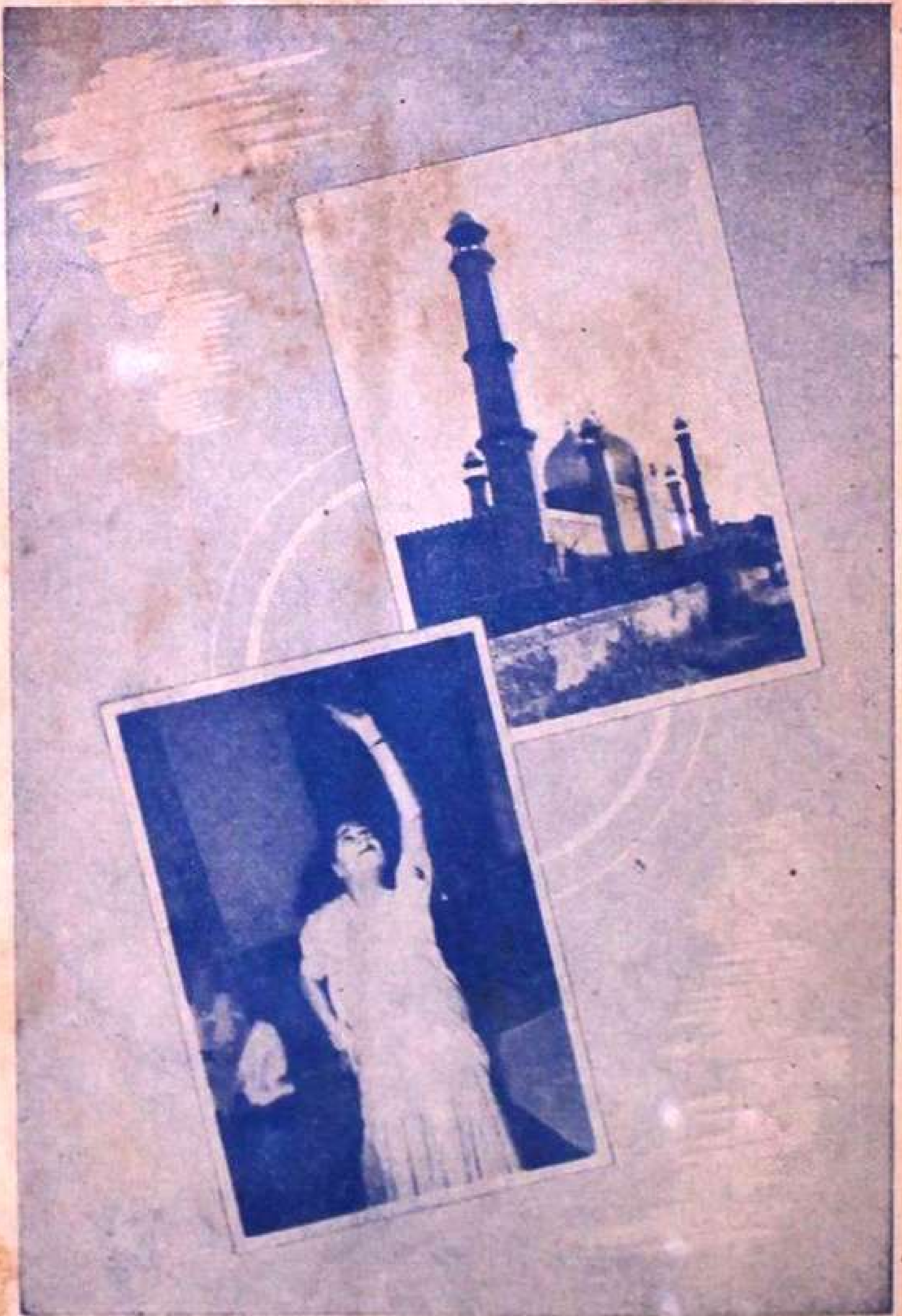
——— گفتنی و ناگفتنی

تعلیم و تربیت ——

دو زاویے ـــــــ

تاش کے پتے ——

—— کاش کہ مادر نہ زادے

یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی
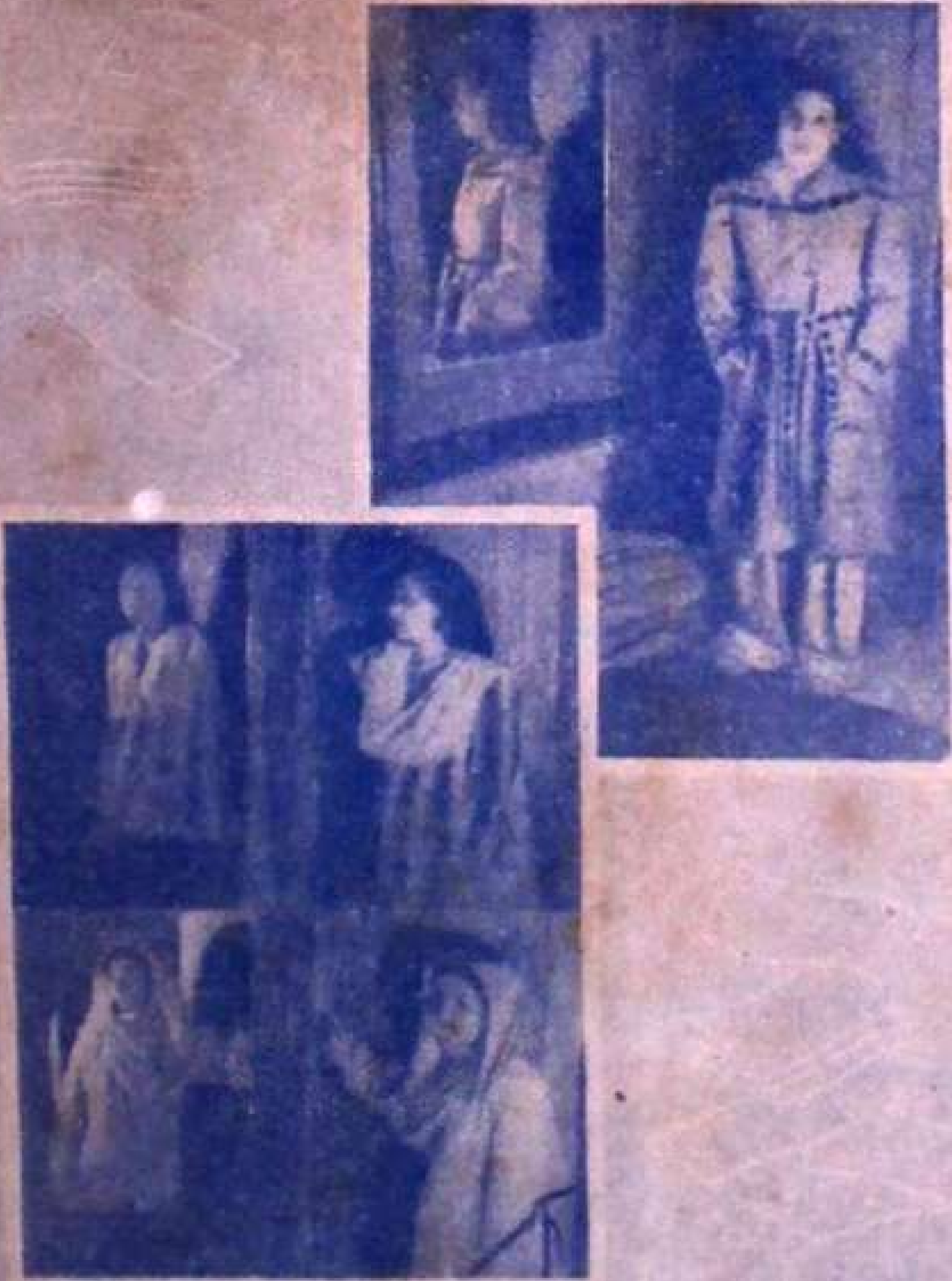
—— رات گئی بات گئی

محض پیالیاں
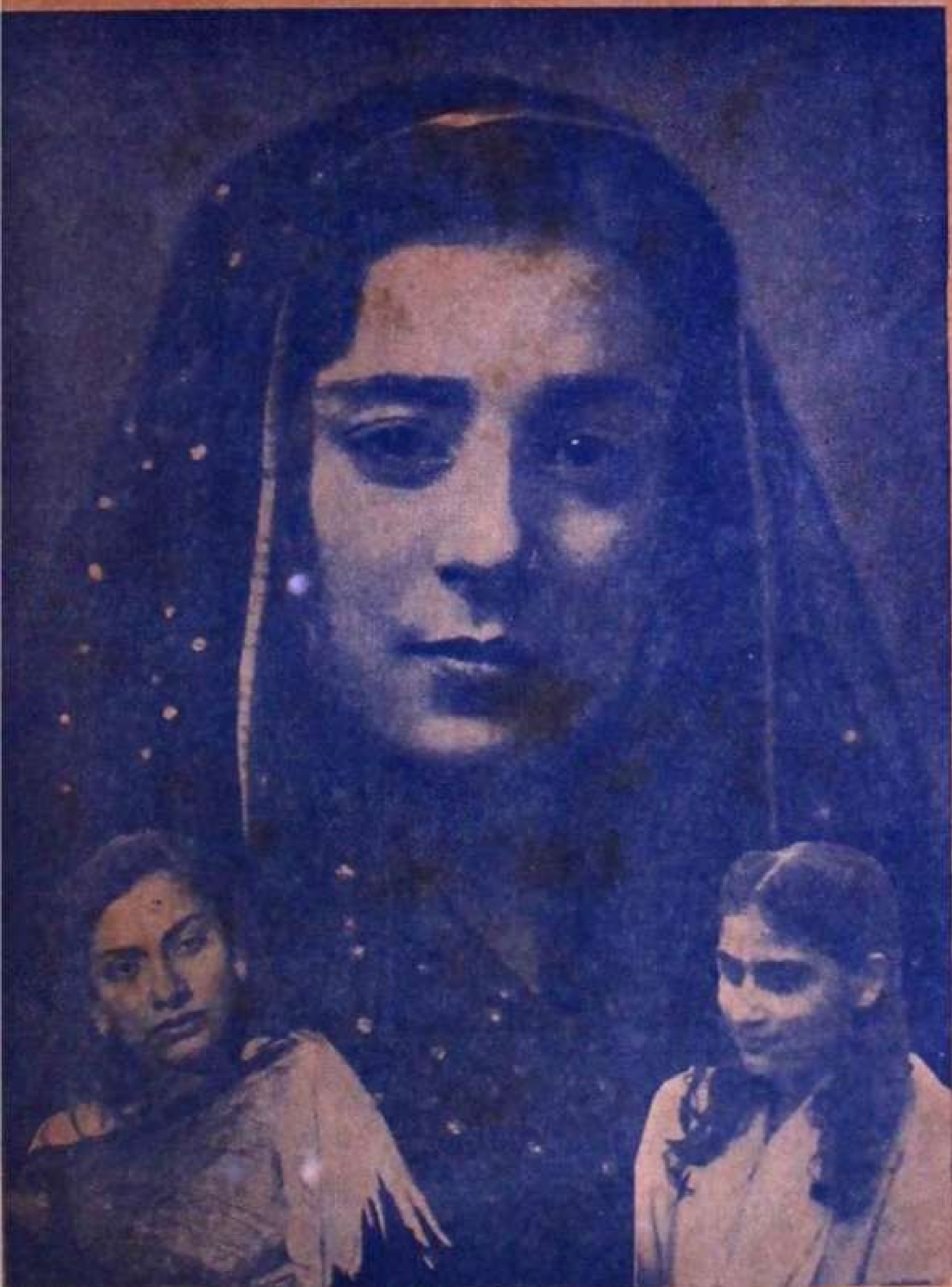
اور کبھی کبھار اُسکے اندر سے عورت جھانکنے لگتی ہے

چہرہ نما

یاد رکھیے، اتنی دیر اس کتاب کے لکھنے میں نہیں لگی جتنی مدت اس سوچ میں صرف ہوئی ہے کہ اس کتاب کا انتساب ہو تو کیونکر؟ ہمارے ہاں ہر کتاب کے لیے انتساب ضروری ہو گیا ہے، عام طریق تو یہ ہے کہ اپنے کسی دوست یا بھائی یا بزرگ کے نام معنون کر دی جاتی ہے بعض مصنف اداروں کو ترجیح دیتے ہیں بعض خاندان کے کسی فرد کو نذر گزرانتے ہیں، اب ایک اور رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے ——— کہ مصنف پہلے تو بعض گفتنی و ناگفتنی یادوں کی عمارت کھڑی کرتا ہے، اور پھر اس میں ارادت کی شمعیں جلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے سامنے اس رعایت سے کوئی عمارت یا ادارہ نہیں ہے۔ لے دے کے دوست رہ جاتے ہیں، جس دوست کے نام پر غور کیا، اس نے کانوں پر ہاتھ دھرا کہ بھائی اپنی عاقبت تو خراب کر لی ہے، ہماری دنیا کیوں خراب کرتے ہو۔ ان میں سے کئی دوستوں کا خیال ہے کہ میں نے یہ کتاب لکھ کر، اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ممکن ہے

اُن کا یہ خیال درست ہو، کیونکہ اس کی اشاعت سے چہ میگوئیوں کے بہت سے دروازے کھلنے کا احتمال ہے، مجھے اپنے کچھ دوستوں کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ مجھ جیسے صحافی یا سیاسی کے لئے اس کتاب کے بعض پہلو بعض اعتبارات سے خطرناک ہیں، جس ملک کے لوگ عیب بینی میں اتنے پختہ ہو چکے ہوں کہ عباؤں کے تار پیچ ڈالیں، اور داڑھیوں کے بال کتر لیں، وہاں یہ توقع رکھنا کہ جوانی تہمت کے بغیر گذر سکتی ہے، ایک "خوش آئند سانحہ" ہے۔ اگرچہ جوانی کا بغیر تہمت گذرنا بھی ایک دردناک المیہ ہی ہے۔

مجھے خود احساس ہے کہ اس پر کوئی حلقہ بھی خوش نہیں ہو سکتا — جہاں تک "اس بازار" کے "اعوان و انصار" کا تعلق ہے، ان کی ناراضی تو سمجھ میں آتی ہے، کہ مصنف نے ان کے چہروں سے نقابیں اُلٹ دی ہیں، اور یہ ناراضی پس منظر کی ہے، لیکن اس سے بڑی ناراضی پیش منظر میں ہے اور وہ ہے اُن "علما" یا "فقہا" کی ناراضی، جو ادب کو بھی "مسلمان" بنانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے، ان کا محور روایتی عقیدے ہیں انہیں اپنی مصنوعی متانت کے سوا کوئی چیز بھی عزیز نہیں ہے، ان کی ٹکسال صدیوں پرانے سکے ڈھالتی ہے، ان کے خیالات مضروب ہیں، ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے سے معذوری ظاہر کی ہے، یہ محرکات پر غور نہیں کرتے، صرف نتائج پر جھنجلاتے ہیں اور ان کی جھنجلاہٹیں بڑھ رہی ہیں۔ اکبر الہ آبادی

نے ان کی تصویر کھینچنے میں کمال کیا ہے ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں!

مگر اندھیرے اُجالے یہ چوکتا بھی نہیں!

ان لوگوں کے بوسیدہ عقیدوں میں نفع و ضرر کی حدیں ہبوطِ آدم کے زمانے سے استوار ہو چکی ہیں یہ محض قدماء کو دیکھتے ہیں، وہ جو کچھ کہہ گئے ہیں، ان کے نزدیک وہی حرفِ آخر ہے، جس چیز پر جو مہر لگ چکی ہے، وہ درست ہے، ان کے عقیدے اہرامِ مصر سے بھی قدیم ہیں، انہوں نے "کیوں ہے"؟ پر کبھی غور نہیں کیا؟ البتہ "کیا ہے" کو ضرور ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

عورت طوائف کیوں بنی؟ اُس نے اپنا گوشت کیوں بیچا؟ اپنے بستر کو شارعِ عام بنایا تو کیوں؟ اس کے بازاروں میں طلوعِ تاریخ سے اب تک گہما گہمی چلی آتی ہے تو کیوں؟ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ زانیہ ہے لہٰذا اس کی سزا سنگساری ہے؟ اور جو لوگ ان کے کاروبار پر مصر ہیں وہ دیوث ہیں؟ محض نفرت اور مجرد اجتناب تو کوئی علاج نہیں یہ روگ اس وقت تک نہیں ٹل سکتا جب تک آپ اس کی تشخیص نہیں کر لیتے

آپ ایک کوڑھی کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں، تپدق کا ایک مریض بھی آپ کی مساعی کا مرکز بنتا ہے، ایک اندھے کے لیے بھی آپ کا دل اچھلتا ہے لیکن اس اخلاقی طاعون پر آپ کیوں چیں بجبیں نہیں ہوتے؟ آپ کے اخلاق

کی آگ کیوں نہیں دہکتی، آپ کا ضمیر کیوں نہیں ٹوکتا؟ آپ چوری چھپے جسم تو خرید لیتے ہیں لیکن کبھی کھلم کھلا ان سے یہ بھی پوچھا ہے کہ تم یہ "تاج محل" کیوں بیچتی ہو؟ تم نے اجنتا کے ان غاروں کی عظمت کو رسوائی کے چولھے میں کیوں جھونک رکھا ہے؟ تم نے مفروضے گھڑ رکھے ہیں کہ اچھی بیٹی ڈولی میں نکلتی اور کفن میں جاتی ہے، لیکن ان "بازاریوں" کے نک سک پر تمہاری رال ٹپکنے لگتی ہے کیوں؟ یہ بھی تو مٹی ہی سے کسبی ہوتی ہیں، آپ کر دیجیے، ان کے بھی حواس خمسہ ہیں، تمہاری طرح نہیں کہ تمہارے سامعہ و باصرہ کی موت واقع ہو چکی ہے اور اب حواس ثلاثہ ذائقہ، شامہ، لامسہ —— پر جی رہے ہو؟

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

مَیں نے یہ کتاب، دسمبر ۱۹۴۹ء میں شروع کی، اس وقت میرے سامنے محض ایک مقالے کا خاکہ تھا، اور وہ مقالہ چٹان میں چھپ گیا، لیکن وہ ہر پہلو سے ادھورا تھا، فاضل بزرگ مولانا عبدالمجید سالک نے اس کو سراہا اور زور دیا کہ اس موضوع پر کتاب لکھ ڈالو، اُن کا خیال تھا کہ ہمارے ادیب زندگی کے کریہہ حقائق پر گفتگو تو کرتے ہیں، لیکن زندگی کے راست مطالعہ سے کنی کتراتے ہیں۔ ان کی اس ہمت افزائی کے باوجود میرے دل میں ایک خوف سا رہا اور سچ پوچھیے تو یہ خوف خدا کا خوف نہ تھا، کیونکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے؛ یہ ایک انسان کا خوف تھا —— سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا خوف —— کچھ

بھی ہو، میرا دل اُن کی ارادت سے اب بھی لبریز ہے، میں نے ان سے جوانی کے متعلق کچھ وعدے کئے تھے، بحمد اللہ انہیں توڑا نہیں، لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے، کیا کچھ نہ کہیں گے، میری رسوائیوں کی کہانیوں سے ان کے کان پہلے ہی پک چکے تھے ممکن ہے میری اس کتاب سے انہیں صدمہ ہو مجھے یاد ہے، شاہ جی نے ایک دفعہ "لیلیٰ کے خطوط" پر نظر ڈالی، تو ان کی پیشانی پر کچھ بل آ گئے تھے، اور آج تک انہوں نے قاضی عبد الغفار کے قلم کو معاف نہیں کیا۔

——— پھر اس بازار سے صحیح سلامت گذر جانا بھی چنداں سہل نہ تھا دولت اور حسن میں انسانی اعمال کی ہزاروں گمراہیاں پوشیدہ ہیں جب ریشمی آنچل دریچوں میں لہراتے اور گداز جسم دڑبوں سے جھانکتے ہیں، تو بالاخانوں کی چاٹ سوا ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں جوانی کے لیے وہ لمحہ بڑا ہی سنگین ہوتا ہے جب آپ اپنے پہلو میں ایک خوبصورت جسم دیکھتے ہیں، ایک کھلا بستر پاتے ہیں، کبھی باہوں کی توسیں پکاریں، اور کبھی پلکوں کی آواز تعاقب کرے اور آپ صحیح سلامت نکل آئیں تو سمجھئے آپ کی جوانی ادھوری ہے۔ ایک دو روز نہیں تین سال تک ان مکانوں کے چکر کاٹے، بیسیوں دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔ سینکڑوں عورتوں سے ہم کلامی کا موقع ملا، کئی آہو چوکڑی بھول گئے۔ کئی خطابت پر ریجھ گئیں، بعض جگہ راتیں بسر ہو گئیں۔ ان کی مدفون عورت

کو جھنجوڑا ـــــ ان کے قہقہوں کو فوارۂ خون میں ڈھالا، ان کے گیتوں کی تانیں توڑ ڈالیں، ان کے زاویہ ہائے رقص بدل ڈالے۔ اُن کی مسکراہٹوں کو آزردہ کیا انہیں رونا سکھایا، اور پھر جو کچھ ان کے اندر تھا، وہ اُگلوا لیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے دامن کہیں بھی آلودہ نہ کیا، آپ اس کو میرے دل کی نیکی پر محمول نہ کیجیے، اس لیے کہ مجھے دل کی صحت پر شبہ ہے، لیکن یہ مان لیجیے، کہ اخلاص ایک دیوار ہے جس سے گمراہیوں کے بہت سے قافلے رُک جاتے ہیں۔

اور یہ کتاب خون کی انہی بوندوں کا مرقع ہے۔ ایک تصویر ہے جس کے خطوط میں نے کھینچے ہیں، لیکن رنگوں کے لیے خون اُن سے لیا ہے ؎

انہی کے "مطلب" کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُنکی

انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اخلاقی وعظ کرتا اور اس کے لیے تبلیغی لفظ چُنتا، اور یہ میرے بس سے باہر تھا، اس قسم کے شرعی وعظ جن میں نفرت ہو انسان کو ضد پر اُبھارتے ہیں۔ تھورو کہتا ہے سچ کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہے ایک وہ جو سچی بات کہے اور ایک وہ جو اُسے سنے، اور یہ فضا ہمارے ہاں سرے ہی سے ناپید ہے، دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں سیاسی محتسب کی حیثیت سے نقد و بحث کرتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی تصویر کا ایک ہی رُخ سامنے آسکتا تھا۔ تیسرا طریق یہ تھا کہ میں مجرد تاریخ لکھتا، لیکن اول تو یہ ممکن نہ تھا۔ ثانیاً اردو

میں نیاز فتحپوری "جنسیات" پر ایک جامع کتاب لکھ چکے ہیں، اور میں نے ابتدائی دو بابوں کے مواد کا ایک حصہ اسی سے اخذ کیا ہے، تاہم میرا موضوع محض تاریخ نہیں تھا، بلکہ کچھ اور بھی تھا، جس کی اہمیت آپ پر اس کے مطالعہ ہی سے واضح ہو سکتی ہے

میں نے جو کچھ لکھا ہے آپ اس کو ایک ادیب کی کاوش کہہ لیجیے۔ ایک ادیب کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ زندگی کا عکاس ہے، وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اپنے دل کی دھڑکنیں سمو دیتا ہے اور پھر اس کو روشنائی سے کاغذ کے صفحوں میں منتقل کرتا ہے۔ ممکن ہے بعض ادیب مجھے ادیب نہ سمجھیں، کیونکہ ادبی دکانداریوں میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے، تو پھر آپ اس کو ایک صحافی کا اداریہ سمجھئے۔ ایڈیٹروں کو عذر ہو تو خطیب کی بڑ کہہ دیجیے جو مجذوب کی بڑ سے زیادہ قیمتی نہ سہی، لیکن بڑ تو ہوتی ہے۔ بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ آپ اس پر کسی الجھن میں پڑیں، آپ اس کو فقیر کے بول بھی کہہ سکتے ہیں، البتہ ایک چیز جو مجھے کھٹکتی ہے، وہ ہے اسلوب بیان۔ آپ کہیں کسی فقرے کی دلکشی میں کھو جائیں، اور جو کچھ بین السطور میں ہے اس کو طاق پر رکھ دیں تو یہ میری بدنصیبی نہیں آپ کی ہو گی۔ میں نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے، وہ موضوع کی مناسبت سے درست ہے، اصل چیز ظواہر نہیں ہیں بلکہ وہ اسرار ہیں جو "تہ خانے" میں ہیں۔

میں نے اِن چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے اسباب کی چھان پھٹک کی ہے، جو نتیجہ برآمد کیا وہ حسبِ ذیل ہے:۔

سبب	تعداد
انتہائی افلاس	۸۰
خاوندوں کی ترغیب	۲۸
خواہشاتِ نفسانی کی شدت	۳۲
صحبت بد کا اثر	۴۵
والدین کی ترغیب	۵۲
عاشقوں کی بے وفائی	۴۸
سیاسی اغوا	۲۲
والدین سے ناراضی	۱۹
سرپرستوں سے الجھاؤ	۱۳
گھریلو جھگڑے	۸
شوہروں کی دغا	۱۳
ادبی معاشقے	۹
تن آسانی	۹

مخلوط تعلیم	۲۸
ملازمت	۱۱
خاندانی پیشہ	۱۱۲
شوقیہ	۱۷
اتفاقیہ	۱۹
جوشِ انتقام	۱
اور دوسرے اسباب	۳۴
میزان	۶۰۰

آخر میں ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ میں نے روگ تو پیش کر دیا ہے لیکن علاج تجویز نہیں کیا ؛ اس قسم کی باتیں عموماً وہ لوگ کہتے ہیں، جو ایک دوسرے کے سیاسی ہم زلف ہوتے ہیں، میں نے "چور بازار" کی نشاندہی کر دی ہے، اب یہ کام اربابِ حل و عقد کا ہے کہ وہ اب بھی اپنی "معذور عقلوں" کا سہارا لیتے ہیں، یا دستوریہ کی سفارشات کے تحت کوئی قدم بھی اٹھاتے ہیں۔

شورش کاشمیری

رہزنی کا پہلا شکار

عورت میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہے۔ ایک پیدائشی فاحشہ اخلاقی پاگل ہے۔ ایک مجرم اور ایک فاحشہ میں یکساں خصوصیتیں ہیں: ــــــــ!

اخلاق کا فقدان، سنگدلی کا وجود، بدکاری کا میلان، تلون مزاجی، تن آسانی، عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق، اور خود بینی و خود نمائی کا جذبہ ــــــــــــــــــــــــــــــــ!

(لومبروزو)

طوائف کا مستعمل مفہوم بازاری عورت ہے۔ ہر اس عورت کو جو اپنے جسم یا آواز کا بیوپار کرتی ہے ــــ **طوائف کہتے ہیں**۔ ویسے لغت میں طائفہ کی جمع طوائف ہے اور طائفہ جوق (منڈلی) کو کہتے ہیں۔ چونکہ مصر میں رقاصاؤں کی ٹولی کو جوق کہتے تھے اس لیے طائفہ بھی جوق ہی کے معنی میں مستعمل ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ طوائف نے جمع سے مفرد کے معنی پیدا کر لیے، اور اب اس کا اطلاق ہر اس عورت پر ہوتا ہے جو پیشہ کماتی ہے ان فاحشات کو ٹھیٹھ

اردو میں بیسوا یا رنڈی بھی کہتے ہیں۔

یہ کہنا محال ہے کہ سب سے پہلی طوائف کون ہوئی ہے اُس کا تعلق کس ملک یا قوم سے تھا، اُس کے باپ یا بھائی کون تھے اور کس شقی انقلاب نے پہلے پہل اس کو بیسوا بننے پر مجبور کیا۔

مگر بظاہر چند معلومات ہیں جو سینہ بسینہ چلی آتی ہیں یا بعض آثار و مظاہر ہیں جن سے ایک اندازہ استوار ہوتا ہے اور کچھ قیاس ہیں جن پر ایک عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ ان سب کے مطالعہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں رہزنی کا پہلا شکار عورت کی عصمت ہوئی ہے اور غالباً انفرادی ملکیت کا تصور بھی اسی سے ماخوذ ہے ـــــــ یعنی محنت کے استحصال سے مدتوں پہلے عصمت کا استحصال شروع ہو چکا تھا ـــــــ!

جیسے جیسے معاشرہ بدلتا گیا عورت سے تعلقات کی نوعیتیں اور خصوصیتیں بھی بدلتی گئیں ہر زمانہ میں ایک نیا روپ رہا۔ معلوم نہیں دھات اور پتھر کے زمانوں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا صحیح نقشہ کیا تھا۔ لیکن سامنتی دور کی ایک خاص مدت تک ہر مرد، عورت کو شہوانی غذا سمجھتا رہا اور اس کے حصول کا طریقہ شکمی غذا کے حصول سے مختلف نہ تھا۔ ایک طاقتور قبیلہ کمزور قبیلہ کی آبادیوں پر چڑھائی کر دیتا۔ سردار گھوڑے پر سوار ہوتا چند لوگ نقاروں پر چوٹ لگاتے اور باقی نبرد آزما ہوتے۔ حملہ آور مفتوح مردوں کو قتل کر دیتے۔ جو عورتیں مردوں

سے ہم بستر ہو چکی ہوں انکو ہلاک کر ڈالتے۔ کنواریوں کو لشکریوں میں بانٹ دیتے اور اس طرح فاتح بن کر لوٹتے۔

(صحیفہ قاضیون باب ۲۱-آیت ۱۰ لغایتہ ۲۳)

بظاہر عجیب سی بات ہے۔ لیکن ایشیائی اقوام میں برات کا جو طریقہ رائج ہے اس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شادی دراصل اس عسکریت ہی کے ثقافتی ارتقا کی ایک معاشرتی صورت ہے اور یہ جو دلہنیں زیور پہنتی ہیں وہ تمام ان نسوانی فتحمندیوں کے اشارے ہیں مثلاً ہتھکڑیوں کے بدل میں چوڑیاں ہیں یا کڑے، بیڑیوں کی جگہ پاؤں کی جھانجنیں ہیں۔ طوق کی جگہ ہنسلی، مالا اور کنٹھا ہیں۔ نکیل کی جگہ نتھ اور بالیاں حلقہ بگوشی کی "رمزیت" ہیں۔ اسی طرح دلہن کے ماتھے پر جو سونے کا ٹیکا ہوتا ہے اس کی صورت عورت کے اندام پر ہے۔ اب بھی قیدی عورتوں کی جو صدیوں پرانی تصویریں دیکھنے میں آتی ہیں، ان سے اس کی تائید ہوتی ہے" ــــ!

ــــ یہ دور گیا تو اشتراک فی النسواں کی بنیاد پڑی یعنی ایک عورت کو اس مرد کی ملکیت قرار دے دیا گیا جو اس تک دسترس رکھتا تھا، بعض محققین کا خیال ہے کہ فحش کے غیر شعوری مرض کا ابتدائی علاج نظام اُمہاتی اور نظام بطریقی کا قیام تھا، جو ہزارہا تاریخی کروٹوں کے بعد، مرد اور عورت کے موجودہ رشتوں تک پہنچا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے فحش پر بیوائی کی جو مُہر لگی ہے۔ اُس کی عمر چند ہزار برس سے زیادہ نہیں۔ ہاں اس سوال پر خاصا اختلاف ہے کہ فحاشی

عہدِ وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟

بعضوں کا خیال ہے کہ فحش کاری عہدِ وحشت سے بہت بعد کی چیز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد کا انسان اس تصور ہی سے خالی الذہن تھا عورت اور مرد شروع ہی سے ازدواجی زندگی میں رہے، صرف ماحولی صورتیں بدلتی رہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شروع شروع میں ازدواج کی تین صورتیں تھیں۔ اولاً مرد کئی بیویوں کا شوہر ہوتا۔ ثانیاً عورت کے کئی شوہر ہوتے۔ ثالثاً عورت اور مرد ایک محدود زمانہ کے لئے ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہو جاتے تھے۔ چنانچہ عورت کے اس فحش ہی کا نتیجہ دختر کشی کا رواج تھا۔

ایک اور عجیب بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ انسان کے ابتدائی مذاہب سے فحش کا گٹھ بندھن ہے تمام مذاہب انسان کی دکھتی ہوئی پیٹھ کو سہارا دینے کے لئے آئے تھے لیکن مرورِ زمانہ سے اُن کی اصلی روح تو ختم کر دی گئی ایک جسم باقی رہ گیا۔ اور وہ اُن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا جو فحش کے مختلف محرکات کو بھی منجملہ عبادات سمجھتے رہے یہ تو انسان کے ابتدائی مذاہب کا حال تھا۔ خود عالمی مذاہب امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے پیرووں کی نفسی خواہشوں کا شکار ہو گئے اور رفتہ رفتہ انسانی فطرت کی کجروی نے ان میں بھی فحش کے لئے کوئی نہ کوئی گوشہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ آج عالمی معاشرہ میں جتنی

بھی فاحشات ہیں، تمام تر "مذہبی" ہیں اور "مذہبی" اس مفہوم میں کہ وہ "خدا و آخرت" کے تصور پر ہماری ہی طرح یقین رکھتی ہیں ——— !!

یونان کے ایک مشہور سیاح ہیروڈوٹس (۵۰۰ ق م) نے لیڈیا کے سفرنامہ میں شاہ الیاٹیس کے مقبرہ کا جو حال لکھا ہے اُس میں بتایا ہے کہ اُس کی تیاری میں جو رقم صرف ہوئی اُس کا بڑا حصہ پیشہ ور عورتوں کا دیا ہوا تھا اسی مؤرخ کا کہنا ہے کہ عام لوگوں کی لڑکیاں پیشہ کماتی اور اپنے جہیز کیلئے روپیہ جمع کرتی تھیں۔ بابل کے لوگ اپنی عورتوں کو افرودتیہ دیوی کے مندر میں مردوں سے اختلاط کے لئے بھیجدیتے تھے۔ ان عورتوں کی چوٹی میں پھول گندھے ہوتے تھے۔ یہ غیر مردوں کی راہ تکتیں۔ جب کوئی عورت کسی مرد کو پسند آجاتی تو وہ اُس کی جھولی میں چاندی کا سکہ پھینک دیتا وہ طوعاً یا کرہاً اُس سکہ کو قبول کرلیتی اور ساتھ ہو جاتی اور جب مرد اُس کو سرفراز کر چکتا تو گھر لوٹتی اور اُسے فخر کی چیز سمجھا جاتا تھا۔

یونان میں فلوریلیا دیوی کا میلہ آٹھ دن کے لئے لگتا تھا۔ اور ان آٹھ دنوں میں زائروں کے لئے روم کی لڑکیاں سامانِ عیش مہیا کرتی تھیں۔ افریقہ میں اعضائے جنسی عبادت کا جزو تھے اور لوگ انہیں اپنی اپنی دکانوں اور مکانوں میں لٹکائے رکھتے تھے۔ ہندوستان میں اس کی نشاندہی شِو لنگ سے ہوتی ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے تذکروں میں سوڈان اور دوسری آبادیوں

کے متعلق اس قسم کی معلومات درج ہیں یورپ کے غاروں سے قبل از تاریخ کے جو آثار ہاتھ آئے ہیں، ان کی ہیئت سے بھی اعضاء تولید ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سب صورتیں پتہ دیتی ہیں کہ اس تمدنی ارتقاء سے پہلے تمام سماج میں فحش کا رواج تھا اور لوگ جنسی اشغال کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

یہ تو خیر تاریخ سے پہلے کی باتیں ہیں ولندیزوں نے جس زمانے میں جاوا کو فتح کیا تو جنگل میں ایک توپ چھوڑ گئے۔ عوام نے سمجھا کسی دیوتا کا عضوِ مخصوص ہے پوجا شروع ہو گئی۔ بانجھ عورتیں زرق برق لباس پہن کر توپ کی زیارت کو جاتیں۔ اس پر گھوڑے کی طرح بیٹھتیں اور اولاد چاہتیں پھول اور چاول چڑھائے جاتے۔ آخر عیسائیوں نے حکومت پر زور دے کر اٹھوا دیا ـــ!

سکندرِ اعظم کے زمانے میں "مذہبی فحش" کا خاصا زور رہا۔ جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی تو اس قابل نہ تھی کہ تیرے کمر بند پر ہاتھ ڈالا جاتا اور یہ دیوی کے مندر میں سرفراز ہونے کی طرف اشارہ ہوتا۔ بائیبل میں فحاشی کے متعلق بہت سی روائتیں ہیں جب عبرانی کسی مسئلہ میں حلف اٹھاتے تو زور دینے کے لئے اپنے عضو پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے۔ چنانچہ (TESTAMENT) معاہدہ (TESTIMONY) شہادت اور (TESTICLE) خصیتین کا مادہ ایک ہی ہے، قدیم مصریوں میں عضو کو اوپر اٹھا کر قسم کھانے کا رواج تھا۔ اُن کے ہاں اولاد کے لئے

جو تعویذ استعمال ہوتے تھے۔ وہ اعضاء جنسی ہی کی مرموز صورتیں تھیں۔ ڈیون پورٹ کا خیال ہے کہ ہندوؤں کا لنگم، یونانیوں کا فیلس، رومیوں کا سپرپاس اور عیسائیوں کی صلیب مردانہ عضو ہی کی مرموز شکلیں ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ صلیب کا نشان مصر سے مستعار ہے۔ بعض ستم ظریفوں نے تو تثلیث کو بھی عورت کے اندامِ نہانی سے مماثلت دے دی ہے۔ ان کی رائے میں اس کی مقدس توضیحیں بہت بعد کی ایجاد ہیں۔ ڈاکٹر لی الگزینڈر اسٹون نے گرجاؤں کی تعمیری ہیئت پر بحث کرتے ہوئے اسے بھی جنسی اعضاء کی بوقلمونیوں سے مماثلت دی ہے۔

بہرحال ان شہادتوں سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ایک زمانہ میں فحش کو انسانی مذاہب کی سرپرستی حاصل رہی ہے! اور یہ مذہبی فحاشی ہی کے برگ و بار ہیں جو مرورِ ایام سے طوائف کے وجود میں منتقل ہو گئے ہیں۔

آج کی قحبہ عورتیں دراصل قدیم الایام کی "مذہبی فاحشات" کا ردِ عمل ہیں۔ جن عورتوں کو یونان میں ہتائرہ، روم میں کنواری، بابل میں کادشتو، ہندوستان میں دیوداسی، اور بغداد میں جوازی کہا گیا، ان ہی عورتوں کے شہوانی ادارے میں ڈھل جانے کا نام طوائف ہے۔ اور "بازاری فحش" دراصل مذہبی فحش ہی کی ایک دوسری، لیکن کاروباری صورت ہے۔ اس بازاری فحش کے محرکات کئی تھے۔ لیکن بعض یہ ہیں:۔

اوّلاً معاشرے کا اخلاقی ارتقاء جس سے متمدن ملکوں میں ازدواجی

زندگی باضابطہ اور مہذب ہو گئی، اور اس زندگی کو شہوانی انتشار سے بچانے کے لیے پیشہ وروں کو ایک ادارہ بنا دیا گیا۔

ثانیاً مردوں اور عورتوں کے تناسب کا فرق، جس سے خرابی کے برگ و بار پیدا ہوتے تھے۔ چنانچہ جن ملکوں میں، یہ فرق بڑا ہی نمایاں ہے وہاں فحاشی بھی اسی نسبت سے نمایاں ہے۔

ثالثاً، وہ افراد، جن کی بے ڈھب عیاشیاں، خاندانی عزتوں کے درپے ہوتی ہیں۔

رابعاً، طبقاتی سماج میں اقتصادی تفاوت اور انفرادی ملکیت کی مضرتیں ——— وغیرہ

حکیم سولن دنیا میں پہلا شخص گذرا ہے۔ جس نے خانہ بہ خانہ فحاشی کی روک تھام کے لئے یونان میں **سب سے** پہلا چکلہ قائم کیا اور بزعم خویش ان جنسی کجرویوں کو روکنا چاہا، جن میں پورا یونان محصور تھا۔ یونانی قوم کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ سب سے پہلے جن دو انسانوں کے مجسمے اظہارِ عقیدت کے لیے بنائے گئے، ان میں ایک فاعل تھا دوسرا مفعول ——— **ہر موڈیس** اور ارسٹوگیٹن، اگر کسی لڑکے کو چاہنے والا شہسوار نہ ملتا تو وہ شرم محسوس کرتا۔ اور ایسا لڑکا عزت کا مستحق سمجھا جاتا جس کے درجنوں عشاق ہوتے کئی شہروں میں لڑکوں سے شادی رچانے کا رواج تھا۔ یونانی خرافیات

میں ایسے سندروں کا ذکر موجود ہے، اور بعض کتبے ملے ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ لڑکوں سے شادی کا رواج دراصل ضبطِ تولید کی طرف پہلا قدم تھا۔ خود **سقراط** نے اس فعل کو مستحسن قرار دیا، حتیٰ کہ ارسطو نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ بیویاں ترک کر دیں اور استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ ان حکماء ہی کی توثیق و تحریک پر امرد پرستی خاص خاص لوگوں تک محدود کر دی گئی یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہواروں ہی کو، استلذاذ بالمثل کا حق حاصل تھا۔ غلام اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے لیے سزائے موت تھی جب یہ شوق عام ہو گیا تو اس کو ایک معاشرتی خوبی سمجھا گیا، یونانی حکومت نے اس کی سرپرستی کے لیے مختلف قانون نافذ کیے ———— اُدھر روما کی راجدھانی میں جو چکلے تھے وہاں عورتوں سے زیادہ لڑکے تھے۔ اِدھر پارس کو عجم کہتے تھے اور مذاقِ عجم کی ترکیب اخلاقی احوال کا ایک پورا نقشہ پیش کر دیتی ہے پارس سے یہ وبا اردگرد کے ملکوں میں پھیل گئی۔ افغانستان سے بلوچستان اور سندھ تک پہنچ گئی۔ اُدھر چینی ترکستان میں عصمت فروش لڑکوں کا ایک طائفہ پیدا ہو گیا اور جب سر چارلس نیپئر نے ۱۸۴۵ میں سندھ فتح کیا تو کراچی میں زنانہ قحبہ خانوں کے علاوہ تیس اڈے عصمت فروش لڑکوں کے بھی تھے۔

حضرت لوطؑ کی قوم کا ذکر توریت میں آ چکا ہے۔ چنانچہ استلذاذ بالمثل

کے لئے لواطت اسی سے ماخوذ ہے، توریت میں اغلام بالمثل کے بڑے مرکزی شہر کا نام سدوم بیان کیا گیا ہے، اور انگریزی کا لفظ (SODOMY) اسی سے بنا ہے۔

یورپ میں کئی مسیحی فرمانرواؤں نے قحباؤں کی سرپرستی کی وہ اُن کی آمدنی سے اپنا خزانہ بڑھاتے رہے۔ لیکن بعض نے ان کا قلع قمع کرنا چاہا۔ ایک ہزار برس تک نسلاً بعد نسلٍ اصلاحِ احوال کی کوششیں کی گئیں یہاں تک کہ فاحشہ عورت کے لئے سزا مقرر ہو گئی، لیکن فحاشی کہیں بھی نہ رک سکی۔ بالآخر اُن کے ادارہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ کوریات نے وینس کے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز میں بیس ہزار کے قریب کسبیاں ایسی تھیں جن سے حکومت کو اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ اس سے ایک درجن جنگی جہازوں کے مصارف پورے ہوتے تھے ________!!

یونان ڈھلا تو روما بڑھا۔ وہاں عورت کا درجہ نسبتاً رفیع تھا۔ لیکن روما کا آفتاب بھی ڈھل گیا اور فحاشی کا ایسا زور بندھا کہ سسرو جیسا معلم اخلاق اور سحر بیان مقرر جس نے خطابت کے اصول مدون کئے ہیں، نوجوانوں کے کسبیوں سے حظ اٹھانے کی تائید کرتا ہے۔ ہرچند مسیحیت نے قحبگی کی روک تھام کی لیکن مسیحی ممالک بعض انفرادی مساعی کے علی الرغم وہ کھل کھیلے کہ اب گناہ کا نام آرٹ رکھدیا گیا ہے۔

عالمگیر مذاہب میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو نصف کائنات سے تعبیر کیا اس کے حقوق تسلیم کئے فحش کی مخالفت کی زنا کو حرام قرار دیا اور چکلہ کے تصور ہی کو محو کر دیا لیکن جب مسلمان بادشاہوں کے دل و دماغ اسلامیت کے تصور سے خالی ہو گئے تو سبھی بند ٹوٹ گئے۔ یہ ایک عجیب سی حقیقت ہے کہ ایشیا کے اسلامی ملکوں میں قحبگی کو مسلمان بادشاہوں نے پروان ہی نہیں چڑھایا بلکہ اُس کی کاروباری قبا میں بعض دلچسپ پیوند بھی لگائے ہیں۔ اور یہ صورت حالات ظاہر کرتی ہے کہ عورت بازارِ فحش کی جس منزل سے بھی گزری ہے اس کے ذمہ دار مرد ہیں اور صرف مرد۔ مرد نے عورت کو کھلونا سمجھا چنانچہ مرد کی نفسی خواہشوں کے غلبہ کا نام ہی فحاشی ہے کوئی عورت فاحشہ ہونا پسند نہیں کرتی حتیٰ کہ ایک طوائف بھی نسوانی حیا سے تہی نہیں ہوتی ماسوا اُن عورتوں کے جن کی عادت پختہ ہو کر فطرت بن جاتی ہے کبھی کوئی عورت برضا و رغبت مختلف مردوں کا کھلونا بننا گوارا نہیں کرتی آپ کسی بھی کسبی کے دل کو ٹٹولیے اور اُس کی روح کے زخم سے کھرنڈ اتار کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ محض اس لئے مونڈھے پر بیٹھتی ہے کہ اس کی "عورت" مر چکی ہے اور جو باقی ہے وہ عورت نہیں بستر ہے دراصل جسمانی فحاشی ایک طاعون ہے۔ اس کا مریض بھی دق کے مریض کی طرح چار و ناچار زندگی بسر کرتا ہے ——— !

لومبروز کا خیال ہے کہ عورت میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہے۔ وہ ایک پیدائشی فاحشہ کو اخلاقی پاگل کہتا ہے۔ اس کے نزدیک مجرم و فاحشہ کی خصوصیتیں یکساں ہوتی ہیں۔ مثلاً اخلاق کا فقدان، سنگدلی کا وجود، بدکاری کا میلان، تلون مزاجی، تن آسانی، عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق اور خود بینی و خود نمائی کا جذبہ۔ گویا قحبگی مجرمیت کا نسوانی پہلو ہے۔

جن حکماء نے قحبگی کے انسداد کی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے اُن کا خیال ہے کہ قحبگی ناگزیر معصیت ہونے کے باوجود ایک مفید ادارہ ہے جو معزز گھرانوں کی عفت و عصمت کا پشتیبان ہے۔ ایک فلسفی شاعر کا قول ہے "کسبی اخلاق عامہ کی بد اخلاق نگراں کار ہے"۔

بلزاک لکھتا ہے طوائف خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی اور اپنے جسم کو معزز خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہے۔ شوپنہار کہتا ہے کسبیاں وحدت ازدواج کی قربان گاہ پر انسانی قربانیاں ہیں۔

لیکی نے تاریخ اخلاق یورپ میں کسبیوں کو بے شمار خاندانوں کی پارسائی کا نگہبان قرار دیا ہے، ایک عجمی مصنف نے لکھا ہے کہ اس معاشرہ میں استلذاذ بالضد کا بہت بڑا بوجھ طوائف کے کاندھوں پر ہے۔

ضروری نہیں کہ ہم ان رایوں سے اتفاق کریں ان کے مصنف غالباً سماج کے معاشی تعلقات پر غور نہیں کرتے حالانکہ جتنی خرابی ہے وہ طبقاتی

ہے اور طبقاتی ملکوں ہی کے فکر و عمل نے طوائف کو ناگزیر معصیت قرار دیا ہے ——— !

طوائف کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اس نے اپنے "حسن قبیح" کے باوجود بڑے بڑے دماغوں پر حکومت کی ہے، کئی شہنشاہوں کو زیر نگیں کیا، کئی مملکتوں کو اجاڑا، کئی فرمانرواؤں کو جھکایا، عیاشیوں کے خزانے لٹوا دیئے۔ سلطنتوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں، حرمات شاہی کو خون کے آنسو رلوایا، نسل انسانی کو جنگوں میں جھونکا، اور جن کی گردنوں میں پگھلا ہوا سیسہ تھا، انہیں مجبور کیا کہ موم بتی کی طرح پگھلیں۔ چنانچہ یورپ اور ایشیا کے اوراق تاریخ کا ایک بڑا حصہ ان کے اذکار و اشغال سے پُر ہے۔ مثلاً :۔

طوطیہ دی آرگونہ کی شعریات ہسپانوی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ ورونیکا فرانکو یونانی علم الاصنام کی ماہرہ ہوئی ہے۔ فرانس کا شہنشاہ ہنری سوم اس کی ملاقات کو خود حاضر ہوا تھا، اور چلتے وقت اس کی تصویر لے گیا تھا۔ نینون دی لنکلوس کے حسن و جمال کا اتنا شہرہ تھا کہ خاندان سیونہ کی تین پشتیں اُس کے چاہنے والوں میں گزریں۔ اس کا مکان بڑے بڑے درباروں کو مات کرتا تھا۔ رہوڈوپی ایک مشہور کسبی ہوئی ہے جس نے مصری اہرام میں سے ایک ہرم بنوایا تھا۔ پیریکلز کے متعلق پلوٹارک نے لکھا ہے کہ اس نے اسپاسیا نام کی ایک کسبی کو خوش کرنے کے لئے ایتھنز کو

جنگ میں جھونک دیا۔ خود سقراط اس کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ ——— !

انقلابِ فرانس نے فحش نگاری کے ایک نئے دور کو جنم دیا۔ ایک فرانسیسی مصنّف لکھتا ہے کہ اس انقلاب کی حیثیت جمہوری اور سیاسی ہے، اخلاقی اور روحانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب خانے محلسرا بن گئے۔ بازاریاں بیگمیں ہو گئیں۔ اور بدچلن پناہ گزینوں نے ہم سب کو نستعلیق کر دیا، آج عیاشوں کے گروہ ہمارے بازاروں میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔

صنعتی یورپ نے مقدس فحاشی کو تو قریب قریب ختم کر دیا لیکن اس کی جگہ مہذب فحاشی آ گئی فحش و گناہ کی نئی نئی تعبیریں کی گئیں۔ اخلاق کو اضافی شے کہا گیا، علانیہ بحثیں ہونے لگیں کہ عفت کس بلا کا نام ہے، تقویٰ کس کو کہتے ہیں؟ جو چیز مناکحت سے جائز ہو جاتی ہے وہ بغیر مناکحت کیوں جائز نہیں جب ہاتھ ملانا کوئی جرم نہیں تو جسم ملانا کیوں جرم ہے؟ اچھائی یا برائی کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ دونوں ہمارے اپنے ہی فکر کا پرتو ہیں۔

فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نوجوان پود نے ان نظریوں کی اشاعت کے لئے اپنا سارا زورِ بیان صرف کر ڈالا انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژساں ایک مشہور فرانسیسی ادیبہ ہوئی ہے، جس نے جنسی تعلقات کی رنگا رنگی پر زور دیا ہے۔ الغرض پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ — ۱۹۱۸)

میں یورپ نے اخلاقی قدروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تمام یورپی ملکوں میں فرانس بازی لے گیا فرانسیسی اکابر کا ایک ہی نعرہ تھا! ــــــــ
"بچے جنو اور جناؤ" مناکحت کی ضرورت نہیں۔ کنواری یا بیوہ جو عورت بھی وطن کے لئے رحم کو رضاکارانہ پیش کرتی ہے وہ عزت کی مستحق ہے۔ ان عورتوں کو اُم الوطن کا خطاب دیا گیا۔ ایک فرانسیسی قائد لکھتا ہے :۔

"پچھلے پچیس ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ "حرامی بچہ" حلالی بچے کا ہم رتبہ ہو گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں، تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے ــــ"

ایک معلمہ ناجائز بچہ جننے کے جرم میں معطل کر دی گئی تھی۔ اس کو فرانس کی وزارت تعلیم نے اس بنا پر بحال کیا کہ نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ ہے فرانس کے ۱۲۷ ویں ڈویژن کے کمانڈر نے دورانِ جنگ میں ایک حکم نامہ جاری کیا تھا۔ جس کے الفاظ یہ تھے :۔

"معلوم ہوتا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بندوقچیوں کے ہجوم اور اجارہ کی وجہ سے سوار اور پیادہ سپاہیوں کو شکایت ہے، ہائی کمانڈ عورتوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کوشش کر رہا ہے، جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا بندوقچیوں کو ہدایت کی جاتی ہے، کہ وہ زیادہ دیر تک اندر نہ رہا کریں، اور اپنی خواہشات کی تسکین میں عجلت سے کام لیں۔"

جنگِ عظیم نے تجارتی قحبہ خانوں ہی کو نہیں بڑھایا بلکہ خیراتی قحبہ خانے بھی قائم کیئے۔ ان خیراتی قحبہ خانوں کا مقصد فوجیوں کی دلجوئی تھا، فرانس کی وزارتِ جنگ نے ان خیراتی قحبوں کو (WAR-GOOD-MOTHAR) کا لقب دیا۔ اور اردو اس کے ترجمے ہی سے معذور ہے، اب کئی برس سے فرانس میں قحبگی کا پیشہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی تجارت اور اجتماعی صنعت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کئی لمیٹڈ کمپنیاں قائم ہیں، ان کے کارندے بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں، اخبارات میں ان کے اشتہارات چھپتے ہیں، جن ملازموں کے سپرد ملک کے مختلف حصوں سے ان "عروسانِ یک شب" کی فراہمی کا کام ہوتا ہے وہ اس پیشہ کی باقاعدہ فنی تربیت حاصل کرتے اور دفتری معیار پر کام چلاتے ہیں۔

جرمنی میں ڈاکٹر ماگنوشس نے لواطت کے حق میں چھ سال تک جدوجہد کی اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ احتساب اٹھالے ڈاکٹر ماگنوشس کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ جانبین رضامند ہوں تو حکومت کے لئے کونسا عذر رہ جاتا ہے، کیا اس سے مملکت کو نقصان پہنچتا ہے؟ کیا یہ زیادہ فطری طریقہ نہیں، جو لوگ اس کو غیر فطری کہتے ہیں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں، محض ایک فرسودہ قول دہرائے چلے جاتے ہیں اس کے برعکس عورت کو مرد سے اختلاط کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، یا تو وہ ماں بن جاتی ہے اور یا بچے ضائع کرتی ہے، لیکن لواطت میں اس قسم کا کوئی خطرہ

نہیں بلکہ اس ہم جنسی سے تمباؤں کی افزونی بھی رُک سکتی ہے ——

وغیرہ وغیرہ

انگلستان کی اخلاقی سطح فرانس کے مقابلہ میں اچھی ہے۔ لیکن تمام ملک میں فاحشات اور اُن کے ادارے کو تسلیم کیاجاتا ہے۔ بلکہ اب تو گناہ کے تصوّر کی نفی سے ان کی مختلف الاسماء صورتیں قائم ہوچکی ہیں۔ امریکہ میں قحبہ خانے آرٹ کے درجے میں ہیں۔ رقص خانے ہیں، حسن گاہیں ہیں، مجالس شبینہ ہیں، آرائش کدے ہیں، ریٹائرمنٹ روم ہیں۔ ان سب کی بدولت امریکہ میں ہر سال کم سے کم ۱۵ لاکھ حمل ساقط ہوتے ہیں اور دہ ہزار ہا حرامی بچے اس پر مستزاد ہیں جو موت کے گھاٹ اتار دئے جاتے ہیں۔ مجلس اقوام نے مختلف ملکوں سے فاحشات کے جو اعداد و شمار حاصل کئے ہیں، وہ برائے نام ہیں۔ جتنی فاحشات تمام عالمی ملکوں میں بیان کی گئی ہیں؟ اُتنی فاحشات ان میں سے کسی ایک ملک میں ہیں۔ اس بورژوا سماج نے (جو استحصال کے نقطۂ آخر تک پہنچ چکا ہے) دو چیزیں وافر کردی ہیں۔ اولاً محنت کی لوٹ کھسوٹ، ثانیاً عصمت کی لوٹ کھسوٹ، سماجی نظام کے ڈھیلا پڑ جانے کی وجہ سے پیشہ ور فاحشات تو ختم ہو رہی ہیں مگر اُن کی جگہ غیر پیشہ ور فاحشات نے لے لی ہے۔ ہر متموّل انسان کو ذہنی و جسمانی عیاشی کے لئے پورے سماج پر دسترس ہے تمام معاشرہ ایک طوائف ہے اور پورا آرٹ ایک چکلہ اور رسل کو

اندیشہ ہے کہ آئندہ نصف دُنیا کے باپ وزرار ہونگے
یا پادری ——————— ۹

ایک ہی تنور کی سوختہ

کمہار نے ایک خوب صورت آبخورہ بنایا۔ لوگوں نے اُس کو جامِ صہبا بنا لیا۔
—— کمہار نے ایک جامِ صہبا بنایا اور لوگوں نے اُس کو آبخورہ سمجھ کر
مسجد کی دیوار پر رکھ دیا تو پھر کیا اُس سے مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ پیالہ
میں چاہے شراب بھر دو چاہے زمزم —— عورت کو بیسوا
بنا دو یا گھر کی ملکہ، جو چاہے بنا دو۔ لیکن ہر حال میں وہ عورت ہی ہے۔
!! —— (قاضی عبدالغفار)

ایشیا میں طوائف کا معاشرتی نظام یورپ کے معاشرتی نظام سے مختلف
ہے لیکن جنسی اعتبار سے دونوں میں ہم رنگی ہے۔ دونوں بازاری شراب
میں جو فرق ہے اس کی بڑی وجہ ایک تو مشرق و مغرب کے جداگانہ اخلاقی
نظریے ہیں دوسرے عورت کے متعلق دونوں کے عقائد کا اختلاف ہے۔
ویسے یورپی عورت، ایشیائی عورت سے سماجی آزادی میں، کجروی کی

حد تک آگے نکل چکی ہے اور شرم و حیا کے وہ معیار جو مشرق کی جان تصور ہوتے ہیں، اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ایشیائی ملکوں میں ایک طوائف بھی حدودِ اخلاق کے ظواہر کی پابندی کرتی ہے ——!

وجہ یہ ہے کہ ایشیا ہر بڑے مذہب کا مولد و مسکن رہا ہے۔ ان مذاہب نے ایشیائی قوموں کو ایک اخلاق مہیا کیا جس سے ذہنوں میں اوامر و نواہی کا ایک تصور جاگزیں ہو گیا، اور کبھی کسی فلسفی یا مصنف کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ فحاشی کا جواز پیدا کرے یا یہ کہے کہ طوائف ایک ناگزیر ادارہ ہے۔

لیکن اس اخلاقی گرد و فر کے باوجود ایشیائی ملکوں میں فحاشی معدوم نہ ہوئی۔ اس کی مختلف صورتیں ہر حال میں اور ہمیشہ قائم رہی ہیں چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی تصنیف "کام شاستر" میں ہندوستان کی دھار مک فحاشی کا سراغ ملتا ہے جنوبی ہند کے لوگ اپنی بیٹیوں کو مندروں کے بھینٹ چڑھا دیتے۔ جنہیں دیو داسیاں کہا جاتا۔ یہ کنیائیں سنگیت اور ناچ کی تعلیم حاصل کرتیں جب تک جوانی کا روپ جھلمل جھلمل کرتا ان کے قدردان بھی موجود رہتے۔ جب جوانی ڈھل جاتی تو انہیں مندروں سے نکال دیا جاتا دربدر بھیک مانگ کر گزارہ کرتیں ان سے کسی ذات کا کوئی ہندو شادی نہ کر سکتا تھا ان سے یا تو مندر کے مہنت خوش وقت ہوتے تھے یا تعلقداروں یا زمینداروں کو ترغیب دے کر انہیں داشتہ رکھنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں دھارمک فحاشی کا ایک بڑا ثبوت لنگم ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آریائی تہذیب نے عورت کو ازدواجی سکون مہیا کیا۔ وہ جس مرد کی شریک زندگی ہوتی اُس کی موت پر اُس کے ساتھ ستی ہو جاتی۔ لیکن عورت کے جسم کو ہمیشہ ہی خطرہ رہا اور اُس وقت سے رہا جب لکشمن نے سروپ نکھا کی ناک کاٹی۔ راون نے سیتا پر ہاتھ اٹھایا اور پانڈو دروپدی کو ہار گئے۔

منوسمرتی میں بیاہ کی آٹھ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ آٹھویں قسم "پشاچ بواہ" ہے جس کے معنی ہی حرامکاری کے ہیں۔ بائبل میں عبرانیوں کی حرامکاری کا ذکر ہے۔ عرب میں حضورؐ کی بعثت سے پیشتر بیت اللہ کے دروازہ پر زنا کے قصیدے لٹکا کرتے تھے۔ مکہ میں جو فاحشہ عورتیں تھیں وہ باندیوں میں سے تھیں۔ عبیداللہ کا باپ زیاد انہی بیسواؤں میں سے تھا۔ مؤرخوں کا خیال ہے زیاد امیر معاویہ کے والد ابوسفیان کے صلب سے تھا۔ امیر معاویہؓ نے اسی تعلق پدری کا واسطہ دے کر زیاد کو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے الگ کیا تھا۔ لیکن اُس دور قبل از اسلام میں بھی کوئی آزاد عورت فاحشہ نہ تھی حالانکہ عورتوں کا عشق عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ شوہر خوش ہوتا تھا کہ اُس کی دلہن کا عاشق پہلے سے موجود ہے۔ اکثر خاوند بیوی کو اپنے پہلے عاشق سے ملنے اور اُس کا چرچا کرنے سے بھی نہ روکتے تھے۔ وہ اس کو فخر سمجھتے تھے کہ اُن کی بیوی فلاں شاعر کی محبوبہ ہے اور اس کے حسن و جمال اور عفت و طہارت کا تمام عرب میں ڈنکا بج رہا ہے۔

ایک بدو سے پوچھا گیا کہ تمہارے ہاں عشق کا مفہوم کیا ہے؟ اُس نے کہا ہم محبوبہ کو سینہ سے بھینچ کر اُس کے ہونٹوں سے ہونٹ پیوست کر دیتے، لعابِ دہن سے شاد کام ہوتے اور اُس کی دلآویز باتوں سے دل زندہ کرتے ہیں۔ ایک عرب شاعر کا قول ہے :-

"محبوبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سراسر محبت کے لئے، دوسرا شوہر کا جس پر کبھی آنچ نہیں آتی"

حضرت زرتشت نے، بدکار عورتوں کے لئے تباہی کی دعا کی ہے۔ ترکستان میں کسبیوں کے، بڑے بڑے بازار تھے اور ان کے مکانوں میں جانا خلافِ اخلاق نہ تھا۔ مشرقی چین میں فحاشی تجارتی بنیادوں پر قائم رہی۔ وہاں کسبیوں کا وہی درجہ تھا جو یونان میں ہتایرہ کا تھا۔ عام چینی اُنہیں پھول والیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ اب ماؤ کی حکومت نے قحبہ خانوں کو سرے ہی سے کالعدم کر دیا ہے جاپان کی رنڈیوں کے سکونتی بازار کا نام یوشی واڑہ ہے اور انہیں بعض قانونی مراعات حاصل ہیں۔ کوریا میں طوائف کو گیسانگ، یعنی ورق النور کہتے ہیں۔ روس، چین اور حجاز، ان تینوں ملکوں میں عورت کے لئے جسم فروشی ممنوع ہے۔ مؤخر الذکر، تو اسلام کا مولد ہے، لہٰذا، وہاں کسی فرد یا حکومت کو اس قسم کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی اور اوّل الذکر دو ملکوں میں، اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور، اشتراکیت اس قسم کے ادارہ کو سرمایہ داری کی پیداوار پر محمول کرتی

ہے، علامہ حلبی کا قول ہے کہ اسلام نے فحش اور فحشگی کا قلعہ فتح کر دیا تھا۔ حضور سرورِ کائنات فداہُ امی وابی کی وفات کے بعد پہلی صدی تک دنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل مفقود رہی، لیکن جب اسلامیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور مسلمان بادشاہتیں، قیصر و کسریٰ کے نقشِ قدم پر چل نکلیں تو جگہ جگہ لہو و لعب کا بازار گرم ہو گیا، اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ بجز عباسی خلفائے (الا ماشاء اللہ) عورت کو کھلونا بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اب جواری کھلونے تھیں اور کھلونے جواری، جو عروج یا کمال عباسی خلفاء کے عہد میں، انہیں حاصل ہوا۔ اس کی نظیر کسی دور میں نہیں ملتی ایک طرف انہیں فنی تربیت دی گئی، دوسری طرف ان کے اقتدار کو تسلیم کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی بڑی سلطنتیں ان کے حسن و جمال سے ہل گئیں۔

کئی خلفاء نے ان کے اشارۂ ابرو پر تاج و تخت کو قربان کیا، کئی بادشاہ ان کی ایک جنبشِ لب پر فقیر ہو گئے۔ اس اثنا میں لونڈیوں کے طبقے بھی نکھرتے گئے۔ ان میں بھی خاندانی و غیر خاندانی کا فرق قائم ہو گیا۔ جو محض گانے والی تھیں وہ مغنیہ کہلائیں۔ مصر میں انہیں عالمہ کہتے ہیں جو ناچنے والی تھیں، وہ رقاصہ ٹھہریں جو صرف جسم بیچتی تھیں انہیں طوائف کہا گیا، ادھر ہندوستان میں مغلوں نے اور بھی گل کھلائے، ظاہر ہے کہ طوائف عشرت کی چیز ہے اور مردوں نے اسی لئے اس کو تخلیق کیا ہے جب مقصد عشرت ہو اور وہ بھی

نفسی تو پر دہ تمام لوازم یکے بعد دیگرے جمع ہوتے جاتے ہیں. جن سے نفس کو تسکین ہو چنانچہ طوائف کے ساتھ وہ تمام سامانِ عشرت جمع کر دیا گیا جس سے عیاشی فن ہو گئی اور طوائف، ———— فن کار۔

اِدھر جاری نتیجہ خیز جنگ کا جب فتوحات کا سیلاب ٹھیر گیا تو کنیزوں کی فراہمی بھی رُک گئی۔ جس سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اُدھر مسلمان خلفا اسلامیت کی رُوح کو کھو چکے تھے اور صرف ظواہر کے پابند تھے۔ انہیں رجھانے کے لئے، کنیزوں کو درآمد کیا گیا۔ جس سے بردہ فروشوں کا گروہ پیدا ہو گیا۔ جو ترکیہ، سسلیہ، ہندوستان، آرمینیا، روم، اور افریقہ سے نوجوان لڑکیاں لاتا اور بغداد میں فروخت کرتا تھا۔ اُن کی سب سے بڑی مارکیٹ کا نام سوق الرقیق تھا، جہاں، متعدد مکان، اکثر دوکانیں اور بیشتر احاطے تھے۔ تمام ملکوں کی کنیزیں حسن و خوبی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتیں، سب سے قیمتی کنیزیں مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد اور مصر کی ہوتیں، ایک تو ان کا لہجہ مصفا ہوتا دوسرے حاضر جواب ہوتیں۔ خود بادشاہوں کی پیشانیاں اُن کے کمال سے بھیگ جاتی تھیں۔ اس بازار کا ایک حصہ نو آمد کنیزوں کے لئے مخصوص ہوتا۔ انہیں عریاں حالت میں لایا جاتا۔ بال کھلے ہوتے۔ کوئی سنگار نہ ہوتا۔ مقصود یہ تھا کہ خریدار طبعی حسن کا جائزہ لے سکیں۔ مختلف تاجر، حسن و رعنائی کے معیار پر اُن کی قیمت لگاتے! اور دام چکا کر خرید لیتے۔ تاجر اس خام مال کو

تعلیم و تربیت کی کٹھالی میں ڈال دیتے جب وہ پختہ ہو جائیں تو انہیں بہت گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا۔ چنانچہ اکثر موسیقار، عالمہ، فاضلہ، اور مدبر عورتیں ان کنیزوں ہی میں سے ہوئی ہیں، اُن کے بطن سے بڑے بڑے خلفاء اور اُمرا بھی پیدا ہوئے ہیں۔

تمام بازار، مختلف الاصل لونڈیوں سے پُر ہوتا۔ بڑے بڑے تجار اور امراء جمع ہوتے، فروختار آواز لگاتا۔

"اے تاجرو! اے دولت مندو! نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے، اور نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سُرخ ہے گوشت نہیں اور نہ ہر سفید چیز چربی ہے۔ اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو یہ ایک بیش بہا موتی ہے۔ زرِ خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو ——— ؟؟"

ایک ایک کنیز کئی کئی ہزار درہم میں نیلام ہوتی۔ گاہکوں کو حق ہوتا تھا کہ وہ انہیں عریاں حالت میں بھی دیکھ سکیں چنانچہ اہلِ عرب نے، مختلف ملکوں کی کنیزوں کے احوال و اوصاف پر کئی کتابیں لکھی ہیں، مثلاً:۔

نجابت کے لئے فارس، خدمت کے لئے روما، کھانے پکانے کے لئے حبشہ، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے ارمینیا، کی لونڈیاں، معیاری سمجھی جاتی تھیں۔

حسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔ اس بردہ فروشی کے ماہر اتنے زیرک تھے کہ وہ کسی لونڈی کو اس کی ذہانت کے قیافہ پر خرید لیتے تھے متوکل کے پاس چار سو کنیزیں تھیں، ہارون الرشید کے پاس دو ہزار جن میں سے تین سو ارباب نشاط تھیں، ام جعفر برمکی کے پاس کئی ہزار لونڈیاں تھیں۔ ہارون الرشید نے ایک کنیز کو ایک لاکھ دینار میں خرید کیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے اپنی لونڈی زلفا کے ستر ہزار دینار ادا کئے تھے، جعفر برمکی نے ایک کنیز کو چالیس ہزار دینار میں حاصل کیا۔ کبھی کبھار عباسی خلفاء خرید کے سوال پر برہم ہو جاتے تھے۔ کتاب الاغانی اور عقد الفرید میں اس قسم کے کئی واقعات درج ہیں ہارون الرشید تخت پر بیٹھا، تو حکم دیا کہ فلاں لونڈی ایک لاکھ دینار دے کر خرید لی جائے۔ یحییٰ بن خالد (وزیر سلطنت) نے عذر کیا۔ رشید برہم ہو گیا۔ یحییٰ نے تمام روپیہ اس کے کمرے میں بکھیر دیا، رشید سمجھ گیا کہ یحییٰ نے اس کے اسراف پر چوٹ کی ہے، امین نے جعفر بن ہادی سے کہا، بذل نام کی کنیز کو خرید لو جعفر نے انکار کیا امین کو غصہ آیا اور حکم دیا کہ بذل کو سونے میں تلوا کر خرید لو تعمیل کی گئی اس کی قیمت دو کروڑ درہم ہوتے تھے ——— !

پھر ان لونڈیوں کا امور سلطنت میں جو دخل رہا وہ مخفی نہیں انکے کارناموں

سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید بن عبدالملک کا عشق ذات الخال کے ساتھ تاریخی شہرت رکھتا ہے۔ ہارون الرشید کی ماں خیزراں خود کنیز تھی، مقتدر کی ماں بھی کنیز تھی اور ملکی سیاسیات پر ان کا جو اثر تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جہاں کہیں مسلمان بادشاہتوں کے "ڈیرے" گئے، اُن کے ساتھ لونڈیوں کا ادارہ بھی گیا، جب خلافت ملکی حدود میں بٹتی گئی تو یہ بھی ان کے ساتھ تقسیم ہوتی گئیں۔ خلیفہ عبدالرحمٰن اندلسی کی کنیزیں خاص شہرت رکھتی تھیں بالخصوص قصر لبنا کی کنیزیں، جو بڑی ہی نامور تھیں۔ فاطمہ، خلیفہ کی خفیہ تحریریں لکھتی اُس کو شعر و انشا میں اتنی دستگاہ تھی کہ کوئی مرد بھی اس کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا۔ خدیجہ نے شعر و غنا میں نام پیدا کیا، مریم نے خاندان اشبیلہ کی لڑکیوں کو شعر و انشار کی تعلیم دی، رقیہ نے شعر و حکایت میں وہ کمال پیدا کیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس کو آزاد کر دیا، جب عبدالرحمٰن انتقال کر گیا تو اُس نے مشرق کا سفر کیا۔ ہر جگہ کے علماء نے اُس کی آؤ بھگت کی ــــــــــــــ

ان لونڈیوں نے شعر و غنا میں ایجادیں کیں، ان کی بدولت امرائے سلطنت قتل کیے گئے۔ مامون الرشید نے علی ابن ہشام سے اس کی ایک خوش جمال کنیز کو طلب کیا علی نے انکار کیا مامون الرشید

نے برہم ہو کر ابن ہشام کو قتل کروا ڈالا۔

ہارون الرشید نے رات کی تنہائی میں کسی کنیز سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی اُس نے صبح پر ٹال دیا، صبح ہوئی تو ہارون نے کنیز کو بلا بھیجا۔ حاضر ہو گئی ہارون نے شب کا وعدہ یاد دلایا، کنیز نے ارتجالاً عرض کیا ــــــ ع

کلام اللیل یمحوہ النہار،

چراغ حسن حسرت نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ؎

رات کی بات کا مذکور ہی کیا   چھوڑیئے رات گئی بات گئی

ہارون مسکرا کر نکل گیا، تمام ملکی شعرا سے کہا کہ وہ اُس پر گرہ لگائیں ابونواس سب میں بازی لے گیا۔ اُس نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمان فرمانرواؤں نے (الاماشاءاللہ) جواری کے جواز سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے محلوں میں سینکڑوں عورتیں اس طرح رہ رہی تھیں جیسے وہ طلائی قید خانے میں ہیں اور ان کی ازدواجی زندگی اصلاً اسارتی زندگی ہے۔ ہر دور میں معاملات کی رفتار یکساں رہی ہے۔

میڈم کلی ہم زلی نے جو ایک ترک وزیر کی اہلیہ تھی، ایک کتاب لکھی ہے۔ "حرم کے تین سال" اس میں اس نے سلطان عبد المجید کے حرم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بیگمیں راستہ چلنے والوں کو جھروکوں سے بلایا

کرتی تھیں جب، اُن سے متمتع ہو چکتیں تو افشائے راز کے خوف سے مروا دیتیں

ایک دفعہ خدیو مصر محمد علی کی بیٹی نازلی خانم کے شوہر نے کسی کنیز سے

ہاتھ دھلوانے کے لئے کہا۔ ہاتھ دھو چکا تو کنیز سے کہا۔ بس بس پیاری!

یہ سننا تھا کہ نازلی خانم کو تاؤ آگیا۔ لونڈی کے قتل کا حکم دے دیا۔ اُس کی کھوپڑی میں چاول بھر کر

تنور میں پکوائے۔ جب خاوند خاصہ پر بیٹھا تو اس کے سامنے رکابی میں رکھ کر کہا

اپنی پیاری کا بھی ایک لقمہ کھا کر دیکھو۔ محمد علی نے سُنا تو بھڑک اُٹھا اور محل سے نکل گیا

مغلوں کا ہندوستان میں ورود ایک مؤرخ کے الفاظ میں اسلام کے

دورِ انحطاط کی یادگار ہے۔ ان کا اسلام کی بنیادوں سے کچھ گہرا تعلق نہ تھا

جب انہیں ہندوستان میں سلطنت کا سکون ملا تو اُن کا جسمانی عیش اپنے

پیشروؤں سے منزلوں آگے نکل گیا اُن کے عشرتکدوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان

کے گرد و پیش عجمی اور ہندی حسن جمع ہو گیا، وہ ذہانت جس سے عربی لونڈیوں کا

شہرہ تھا عجمیوں میں بھی سرایت کر گئی۔ ہمایوں شکست کھا کر ایران پہنچا تو

اُس کا غم غلط کرنے کے لئے دارائے ایران نے، ایک مجلسِ نشاط منعقد

کی، تمام گویّے مدعو کیے گئے۔ ایک مغنیہ نے غزل چھیڑ دی :-

ہمایوں منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد مبارک کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

ز رنج و راحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

ہمایوں کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاہ نے دیکھا تو

مغنیہ کو، مجلس سے اٹھوادیا لیکن اس کی برجستہ ذہانت کو غلبًا سراہا جب ہمایوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کیا، تو، اس مغنیہ کو بلا بھیجا، لیکن پتہ چلا کہ وہ انتقال کرچکی ہے۔ شہنشاہِ اکبر کی داستانہائے نشاط سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مینا بازار لگوایا مینا بازار کا تصور، ترکستان سے مستعار تھا۔ ہر مہینے کی تیسری تاریخ کو قلعہ معلّٰے میں بازار لگتا۔ اس کو خوش روز بھی کہتے تھے۔ تمام اہتمام امرائے سلطنت کی عورتوں کے سپرد ہوتا خواجہ سرا قلماقنیاں اور اردو بیگنیاں اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑائے پھرتیں، مالنیں، چمن آرائی کرتیں، جہانگیر نے مینا بازار ہی میں نواب زین خاں بہادر کی بیٹی صاحب جمال کو دل دیا تھا۔ سلیم مینا بازار کے انگوری پارک سے گزر رہا تھا۔ ایک خادمہ نے عرض کیا۔ صاحب عالم! آپ کو بادشاہ سلامت یاد فرماتے ہیں سلیم کے ہاتھ میں کبوتروں کا جوڑا تھا۔ صاحب جمال سامنے سے آرہی تھیں اس سے کہا لو ذرا ہمارے کبوتر تھامنا ہم ابھی آتے ہیں۔ واپس آئے تو صاحب جمال کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر تھا، پوچھا۔

دوسرا کبوتر کیا ہوا

"صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔"

"کیسے؟"

صاحب جمال نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا۔

صاحب عالم "بول"

اس بول پر جہانگیر لٹو ہو گیا بالآخر صاحب جمال اس کے عقد میں آگئی۔ لاہور کے سیکریٹریٹ میں انار کلی کا جو مقبرہ ہے وہ در اصل اسی صاحب جمال کا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے کبوتروں کے واقعے کو نور جہاں سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے اسی طرح انار کلی کا تمام واقعہ بھی فرضی ہے۔

ایک روز جہانگیر کسی ایرانی شہزادے سے اس شرط پر شطرنج کھیل رہا تھا کہ جو ہارے ایک کنیز دے، اتفاق سے جہانگیر ہار گیا، تمام کنیزیں اکٹھی کی گئیں، سب حسن و جمال میں ایک دوسرے پر فائق تھیں۔ جہان نام کی ایک کنیز کو بڑے تردد کے بعد چن لیا گیا جہان کو ہم جولیوں سے بچھڑنا گوارا نہ تھا۔ عرض کیا۔

تو بادشاہِ جہانی جہاں ز دست مدہ — کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

بادشاہ رک گیا۔ حیات نام کی ایک دوسری لونڈی کو منتخب کیا تو اس نے بھی ارتجالاً عرض کیا۔

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید — اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

جہانگیر نے ایک تیسری کنیز دلآرام کو تجویز کیا۔ وہ خود شطرنج کی ماہرہ تھی۔ عرض کی صاحب عالم مجھے ایک دفعہ بساط دکھا دیجئے پھر کوئی فیصلہ فرمائیے گا۔ درخواست منظور کر لی گئی۔ دلآرام نے غور کیا اور شاہ سے کہا۔

شاہا دو رُخ بدہ و دل آرام را مدہ
پیل و پیادہ بیش کن و اسپ کشت مات

جہانگیر بازی جیت گیا، دل آرام کو اعزاز و انعام سے نوازا۔ آجتک یہ شعر شائستہ کھلاڑیوں کے نوکِ زبان ہے۔

جہانگیر کی ایک بیوی راجہ اودے سنگھ کی بیٹی مان متی تھی۔ شاہجہان اسی کے پیٹ سے تھا۔ تمام محل میں مان متی کے گانے کا شہرہ تھا، جہانگیر خود موسیقی کی نوک پلک سے واقف تھا اور اُس نے اپنی بہت سی خواصوں کو موسیقی کی تعلیم و تربیت کے لئے اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اسی زمانے میں بزرگی کشمیری نام کی ایک طوائف کا بڑا نام تھا۔ اُس کی صحبت میں بہت سے اہلِ عجم بیٹھے تھے، ایک دن ایک عرب بھی جا پہنچا عجمیوں کو شرارت سوجھی اور یہ رباعی لکھ کر اُس کے پاس بھیجدی، ؎

اے شیوۂ کفر و دیں بہم ساختۂ
غم را بوجود و عدم ساختۂ
آثار بزرگی ست از جنبیت پیدا
گہ با عرب و گہ با عجم ساختۂ

بزرگی میں بھی شعر کا ملکہ تھا، جواب میں لکھا ؎

روزے کہ نہادیم دریں دہر قدم را
گفتیم صلاشیت عرب را و عجم را

"گفتیم صلاشیت عرب را و عجم را" پر غور کیجئے، ایک طوائف کی کاروباری سیرت بہ تمام و کمال منعکس ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر میں صاحب مآثرالامراء کے حوالے سے اورنگ زیب کی ازخود رفتگی کا ایک واقعہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:۔

" برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آبادی کے نام سے بس گئی تھی، اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے نغمہ و حسن کی تیرافگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا، صاحب مآثرالامراء نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر کہا ہے:۔

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا!

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اُسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ:۔

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی!

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے، اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی، ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی

کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اُس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی، خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی، جو نغمہ سنجی میں سحرکار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایہ میں سے گزرا، جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے، جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا نہ اُس کی خالہ کا، بے باکانہ اُچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا، خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اُس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا۔

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

صاحب ماثر الامراء نے لکھا ہے کہ "بکمال ابرام و سماجت زین آبادی را از خالہ محترمہ خود گرفتہ، باآں ہمہ زہد خشک و تقشف بحت، شیفتہ و دلدادہ او شد قدح شراب بدست خود پر کردہ می داد گویند روزے زین آبادی ہم قدح بادہ پر کردہ بدست شہزادہ داد و تکلیف شرب نمود" یعنی بڑی منت و الحاح کرکے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس

زہد خشک اور خالص نفقہ کے جس کے لئے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا، کہتے ہیں کہ ایک دن زینی آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز اور رنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگائے، دیکھئے **عرفیؔ** کا ایک شعر کیا موقع سے یاد آگیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے ؎

ساقی تو ئی و سادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمے کند کہ ملک مے گسار شد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دلباختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو:-

مے حاجت نیست مستیم را — در چشم تو تا خمار باقیست

لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا۔

ہنوز ایماں و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی بیاموزاں دو چشم نامسلماں را

ناچار شہزادہ نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگائے گیا و لقد ھمت بہ و ھم بھا کی پوری روئداد پیش آ گئی۔

عشقش خبرز عالم مدہوش آورد — اہل صلاح را بقدح نوش آورد

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لئے آمادہ ہو گیا ہے فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا۔

"غرض امتحانِ عشق بود نہ کہ تلخ کامی شما"

ایں جورِ دیگر است کہ آزارِ عاشقاں چنداں نے کند کہ بہ آزار خو کنند

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ دارا شکوہ نے اس حکایت کو اپنی شکایت وغمازی کا دست مایہ بنایا، وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ "ببینید ایں مزور ریائی چہ صلاح و تقوی ساختہ است؟"

فیضی نے کیا خوب کہا ہے۔

چہ دست می بری آستینِ عشق اگر داد است ببر زبانِ ملامت گرِ زلیخا را!

نہیں معلوم اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا، اورنگ آباد کے بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

اورنگ زیب کے بعد سلطنت کا آفتاب گہن میں آ گیا تمام ملک میں عالمگیری چینٹ الٹ گیا، شمشیر و سناں طاقِ نسیاں پر چلے گئے اور ان کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی، ہر کوئی عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا ہر کہیں طوائف الملوکی

کا دور دورہ تھا، ہر کسی کی آنکھ کا پانی مر چکا تھا، ہر گھر میں وضعداریوں نے دانت نکوس دیئے تھے۔ القصہ تمام ملک لہو و لعب کا ایک عبرتناک مرقع تھا۔

غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی بیٹیوں اور بہوؤں کو ننگے بدن ناچنے پر مجبور کیا۔ وہ ناچنے لگیں اور خود خنجر کھول کر بظاہر غافل ہو گیا، وہ ناچ چکیں تو خنجر اٹھایا اور کہا۔ واقعی تیمور کے گھر سے غیرت مر چکی ہے۔

محمد شاہ نے نادر شاہ درانی کی مدارات کے لئے نور بائی ڈومنی کو گوایا، نادر شاہ اس کے نورانی گلے سے بڑا ہی خوش ہوا، انعام دیا، لیکن ساتھ ہی کہا:-

نور بائی! روئے مند سیاہ کن بیا کہ بہ ایران بریم

نور بائی کا رنگ فق ہو گیا، لیکن پھر سنبھل گئی، اور یہ غزل گائی:-

من شمع جانگدازم تو صبح دلربائی سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی!
نزدیکت ایں چنینم دورم آنچناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ اس برجستہ اور برمحل غزل سے بہت محظوظ ہوا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔ الغرض ان خوش جمالوں سے بادشاہوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور جن عورتوں کو ہم فاحشہ کہتے ہیں وہ اصلاً ان بادشاہوں ہی کے تنور کی سوختہ ہیں۔

طاؤس و رباب آخر

"کس قدر افسوسناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اُس وقت ملتے ہیں۔ جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں" ——— آسکر وائلڈ

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا ہر روز عصر کے وقت چکلہ کا چودھری وسطی بُرج میں آ بیٹھتا تمام رنڈیاں اور گویّے باری باری مجرا بجا لاتے اور جب سورج ڈوب جاتا تو بازار سجتا خریدار آتے تا آنکہ رامش و رنگ میں صبح ہو جاتی سب سے بڑا درباری گویا امیر شمس الدین تبریزی تھا جس کے ماتحت دربار کی بیسیوں رنڈیاں اور گویّے تھے۔

ہندوستان کے قدیم چکلوں کی آبادی جہاں کہیں تھی۔ اُن کا وجود اس کی شہادت دیتا ہے کہ شاہی عمارتوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں میں ہمیشہ

گٹھ بندھن رہا۔ تمام چکلے ملک یا صوبے کی راجدھانی کے اُس حصّے سے ملحق ہوتے جہاں قلعہ ہوتا یا امرائے سلطنت کے محل مثلاً شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس رنڈیوں کے لئے **شیطان پورہ** آباد کیا۔ دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ مغلیٰ سے ملحق چاوڑی بازار تھا۔ لکھنؤ کا چوک واجد علی شاہ کی عمارتوں کے قرب و جوار میں ہے۔ خود لاہور کو دیکھئے، شاہی قلعہ اور لاہور کے چکلے میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ اب امتدادِ زمانہ سے لاہور کی ہیئت کافی زیر و زبر ہو چکی ہے۔ لیکن شہر کی جغرافیائی بناوٹ سے اس کے آثار ضرور مل جاتے ہیں —— قلعہ کی پیٹھ پر بارود خانہ تھا۔ اس کے آگے موتی بازار، ہشیبی سمت پر شاہ عالمی دروازہ اور پھر دائیں کو مڑ کے چکلہ، جو آج بھی بازار چوک چکلہ کہلاتا ہے۔ چوک چکلہ سے لوہاری دروازہ کو نکل آئیے تو انارکلی بازار ہے جس فرضی طوائف ہی سے جہانگیر کے عشق کی داستان منسوب کی جاتی ہے۔

کوئی تیس بتیس برس ہوتے ہیں کہ انارکلی میں طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں لاہور میونسپلٹی کی تجویز پر ان کو اٹھا دیا گیا۔ اُس وقت سے ہیرا منڈی کا علاقہ ان کے لئے مخصوص ہے۔

چکلہ کا لفظ کیونکر وضع ہوا؟ اس پر لسانیات کے ماہر ہی وثوق سے کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لغت میں چکلہ کے معنی قحبہ خانہ کے ہیں۔ ممکن ہے

اس کا مادہ چکیدن ہو جس کے معنی جانور کے اڈے پر بیٹھنے کے ہیں دو مصدر اور ہیں؛ چکاندن اور چکانیدن جو ٹپکانے کے معنی ہیں آتے ہیں۔ چکلہ کا لفظ ان سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے خود چک کا لفظ مختلف المعنی ہے، زمین کے معنی میں بھی آتا ہے، اور مردانہ عضو کیلئے بھی اسی طرح چکلہ کی املا غور طلب ہے ؎ ——— صحیح املا چکلہ ہے یا چکلا۔ پہلی صورت میں "لہ کے معنی پردہ کے ہیں اور دوسری صورت میں "لا" انگوری شراب کو بولتے ہیں، ان مختلف المعنی اشکال پر غور کرنے سے یہ سراغ ضرور ملتا ہے کہ چکلہ کی معنوی خصوصیت انہی الفاظ میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے ——— !

آہستہ آہستہ رنڈیوں کے صفاتی ناموں میں ان کی عشیہ درانہ بوقلمونی سے اضافہ ہوتا گیا بالخصوص اس دور میں جب سلطنت اودھ پر شجاع الدولہ اور پھر واجد علی شاہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور دہلی میں محمد شاہی امراء عورتوں کو چوسر کی نردیں سمجھتے تھے۔

اشرف صبوحی کے الفاظ میں ——— "شہزادے پانی میں پالتی مارے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک زانو پہ پیچوان لگا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے۔ وھنواں اڑاتے اور ٹھمارسنتے چلے جاتے ہیں۔

یہ زمانہ سلطنت کی ویرانی کا تھا صرف ظاہری رسموں اور معنوی معاملوں کا طنطنہ باقی تھا جس نسبت سے بازو کی قوت گھٹتی گئی اسی نسبت سے زبان کی

نزاکت بڑھتی گئی۔ جن کا پیشہ ناچنا اور گانا تھا۔ اُن کو طوائف کہا گیا جن کا کاروبار بدن کی فروخت ٹھیرا وہ کسبیاں کہلائیں یا کمپنیاں اور جو محض "بازاری مال" تھیں یعنی روپے اور جسم میں تبادلہ کر نیوالی بکیائیاں ٹھیریں۔ اُن کیلئے بیسوا، رنڈی، پاتر اور ویشیا کے لفظ بھی مستعمل ہیں۔ جن میں ایک باریک سا معنوی فرق ہے اور اب تو بعض کمین ذاتیں بھی ان میں منسوب ہوتی ہیں مثلاً مراثنیں، ڈومنیاں اور بیرنیاں وغیرہ، کنچن کوئی ذات نہیں صرف پیشے کی رعایت سے ایک ذات بن گئی ہے اور اب اس جمعیت انسانی کو کہتے ہیں، جن کا تعلق طوائفوں اور کسبیوں کے خاندان سے ہوتا ہے۔

شجاع الدولہ اور واجد علی شاہ کے لکھنؤ نے طوائفیت کی مختلف شاخوں کو پروان چڑھایا شاہی عیش طلبیوں نے چکلے کی نوعی تہذیب اور ارباب نشاط کے مخصوص تمدن کو زندگی کے بال و پر بخشے۔ جس سے دیکھتے آنکھوں ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان بادشاہوں کی پوری تاریخ میں طوائف کے عروج کی اتنی بڑی مثال نہیں ملتی۔

شجاع الدولہ نواب صفدر جنگ کا بیٹا تھا۔ جب اُس کی انگریزوں سے صلح ہو گئی تو اُس نے فیض آباد کا سفر اختیار کیا۔ احمد خاں بنگش نے اس کو قصد سفر سے پہلے تین نصیحتیں کیں اولاً مغلوں پر اعتبار نہ کرنا ثانیاً فیض آباد کو دارالحکومت بنانا ثالثاً خواجہ سراؤں سے کام لینا۔ شجاع الدولہ نے ان تینوں

باتوں کو آویزۂ گوش بنالیا، پہلا کام یہ کیا کہ فوج کی کمان خواجہ سراؤں کو سونپ دی، سب سے بڑی ڈویژن میں چودہ ہزار سپاہی تھے۔ جن کی وردی کا رنگ سرخ تھا۔ خواجہ سرا بسنت علی خاں کو ان کا کمانڈر بنایا اسی نام کے ایک دوسرے خواجہ سرا کی ماتحتی میں ایک ہزار سیہ پوش گھڑسوار تھے۔ خواجہ سرا عنبر علی کی زیر ہدایت پانچ سو گھڑسواروں کا دستہ اور خواجہ سرا محبوب علی کی ماتحتی میں پانچسو شہسواروں کی چار پلٹنیں تھیں اور ایک خوش چہرہ خواجہ سرا لطافت علی کے ماتحت فوج کے اتنے ہی دستے تھے۔ علاوہ ازیں شجاع الدولہ کے دربار میں بہت سے زنانہ اور مردانے طائفے تھے۔ شرر مرحوم نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کا دل ہمیشہ خوب صورت عورتوں اور دلفریب رقاصاؤں کے بانکپن کا شکار رہا۔ تمام شہر اور اس کے کوچہ و بازار طوائفوں سے لبریز تھے۔ یہاں تک کہ سلطنت کا چپہ چپہ الناس علی دین ملوکھم کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔ کئی نامور ڈیرہ دارنیاں تھیں جن کے ہمراہ عالیشان خیمے رہتے تھے، جب شجاع الدولہ سلطنت کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتا تو بادشاہ کے ہمراہ خیمے بھی ہوتے، جہاں جی چاہتا خیمے لگا دیئے جاتے محفل جمتی اور آناً فاناً رقص و نغمہ کا چمن آراستہ ہو جاتا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں شجاع الدولہ کا لگایا ہوا پودا ایک تناور درخت بن گیا۔ حتیٰ کہ واجد علی شاہ اور لہو و لعب ہم معنی الفاظ ہو گئے۔ واجد علی شاہ بچپن ہی سے حسن و نغمہ کی

گود میں پلا تھا۔ اور ابھی وہ سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا کہ اس کی عمر کے بہت سے اُجلے ورق طوائفوں کی ہم آغوشی سے داغدار ہو چکے تھے۔ جب تخت پر بیٹھا تو عورتوں سے اس کی رغبت کا یہ عالم تھا کہ اُس نے فوج کی کایا پلٹ دی۔ رسالوں کا نام بانکا، ترچھا اور گھنگھور رکھا۔ پلٹنوں کے نام اختری اور نادری، جو دو مشہور طوائفوں کے نام پر تھے اور جنہیں وہ ممتوعہ کہتے تھے۔ واجد علی شاہ متعہ کو مذہبًا جائز سمجھتے تھے۔ ہر وہ عورت جو ان کی ہوس پر قربان ہوتی۔ اس کو ممتوعہ کے خطاب سے نوازتے۔ ایک دفعہ بھنگن پر جی آگیا۔ تو اس کو فیضیاب کر ڈالا، اور نواب مصفّا بیگم کے لقب سے ملقب فرمایا۔ اسی طرح بہشتن پہ دل للچایا تو اس کو نواب آب رساں بیگم بنا ڈالا۔ ان چہلوں اور چونچلوں میں ان کا جواب نہیں تھا۔ واجد علی شاہ مسلمان فرمانرواؤں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے خوب صورت عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج بنائی،

آج فوجوں میں جو زنانہ دستے نظر آتے ہیں وہ غالبًا اسی نظیر پر قائم ہیں خود بادشاہ کا وزیر علی نقی خاں ارباب نشاط میں سے تھا۔ اُس کی بیٹی نواب اختر محل شاہ کی ملکہ تھیں، اکثر نابالغ اور کم سن لڑکیاں بادشاہ کی نظر کا شکار ہو جاتیں انہیں غیر ممتوعہ بنا کر رکھ لیا جاتا۔ جب جوان ہوتیں تو ممتوعہ ہو جاتیں۔ اور پھر مختلف حالات میں ان کے سپرد گانے اور ناچنے کا کام ہوتا۔ یہ اتنی تعداد میں تھیں، کہ ان کے طائفے بننے لگے ہر طائفہ کا نام

اس کی خصوصیت پر ہوتا تھا۔ مثلاً :-

راوھا منزل والیاں ، جھومر والیاں ، لٹکن والیاں ، ساروھا منزل والیاں ، نتھ والیاں ، گھونگھٹ والیاں ، رہس والیاں ، نقل والیاں اور اچھوتیاں ، ان میں اکثر بادشاہ کے قریب سلطان خانہ میں رہتیں اور بعض کو کوٹھیوں میں محلسرائیں ملی ہوئی تھیں ، جو صاحب اولاد ہو جاتی اُس کو محل کا خطاب دیا جاتا۔ جو صاحب اولاد نہ ہوتی اُس کو بیگم کہتے۔ بیگموں کی تنخواہ روٹی کپڑے کے علاوہ چھ سے بیس روپے ماہوار تک ہوتی۔ لیکن محلات کے زمرے میں آتے ہی دو سو روپیہ ماہوار، رہنے کو محلسرا اور ڈیوڑھی میں دربان وغیرہ رہتے تھے۔ ہر ممتوعہ کا نام چن کر رکھا جاتا۔ پری جمال بیگم ، حور شمائل بیگم ، گلرخ بیگم ، نازک اندام بیگم ، اسی طرح محلات کے نام ہوتے تھے ، نواب خاص محل صاحبہ ، نواب معشوق محل صاحبہ ، نواب دلدار محل صاحبہ ، نواب عاشق سلطان محل صاحبہ ، نواب ممتاز محل صاحبہ ، نواب اختر محل صاحبہ ، نواب قیصر محل صاحبہ —— اور یہ کوئی ستر کے قریب ممتوعات و محلات تھیں ، انہی عیاشیوں کی بدولت واجد علی شاہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بدبختی کا آخری مرقع تھا۔ اُس نے ناچ اور گانے میں وہ ایجادیں کی ہیں کہ آج بڑے بڑے استادانِ فن اس کا لوہا مانتے ہیں۔ وہ کئی راگنیوں اور رتوں کا موجد اور معلم ہے۔ کوئی

رقاصہ کہیں چوکتی تو پلنگ پر لیٹے لیٹے بھاؤ بتا کر اصلاح کر دیتا۔ کسی گویّے کی آواز میں کوئی عیب ہوتا تو فوراً ٹوک دیتا۔ خود تال اور سُر کی ایک ایک ادا کا مزا جیداں تھا۔ اس کا وجود عیش و عشرت کا سراپا تھا۔ کبھی کبھار اپنے اوپر زچگی کی کیفیت طاری کر لیتا، اور بچہ جنتا، اس پر دربار میں مبارکبادیں چلتیں، نیازیں بٹتیں، مجرے ہوتے، جب انگریزوں نے قید کر کے کلکتہ پہنچا دیا تو وہاں بھی عیش و عشرت کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، جن متوعات کا عشق سر پر سوار تھا انہیں قید خانہ سے عشقیہ خطوط لکھتا، اُن سے کچھ نہ کچھ مانگ بھیجتا، مثلاً دلدار محل سے مِسّی مانگی، اختر محل سے زلفوں کے بال، ان بالوں کو سرہانے رکھ کر سوتا، اور بار بار سونگھتا، جعفری بیگم سے دولائی دوپٹہ منگوایا جس سے لپٹ کر بار بار روتا، غرضیکہ واجد علی شاہ نے ایک ایسے لکھنؤ کو جنم دیا جو عیش و نشاط کے سانچے میں ڈھل کر خود ایک کسبی ہو گیا تھا ——— !

لکھنؤ میں رنڈیوں کے تین طائفے تھے:۔

کنچنیاں، یہ نیچ ہندو ذات کی پیشہ ور عورتیں تھیں، جنہوں نے پنجاب سے نقل مکانی کر کے فیض آباد میں ڈیرے ڈالے تھے، ان کے دم قدم ہی سے لکھنؤ کا چکلہ آباد تھا۔

چُونہ والیاں، یہ تعداد میں دوسرے درجہ پر تھیں۔ ان کا کام ناچنا اور گانا تھا۔ ان میں حیدر بانی چُونے والی مشہور طوائف گزری ہے، جس نے نور

کا گلا پایا تھا۔

ناگرنیاں، یہ پنچمیل مٹھائی تھیں جن میں ہر قوم کی فاحشہ عورتیں ضم ہو گئی تھیں ان کی برادری کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا، لیکن ڈیرہ دار نیاں فصیح محاورہ تھیں، جنہیں ہر شخص استعمال کر سکتا تھا، ان کا وجود روزمرہ تھا۔

حیدر بائی کی آواز میں جادو تھا، **گوہر بائی** کا رقص اس بلا کا تھا کہ الہ آباد کی نمائش میں یوریپین محوِ حیرت رہ گئے تھے، کچھ عرصہ بعد زہرہ و مشتری کا طوطی بولنے لگا، زہرہ تو خود شاعرہ تھی۔ قدرت نے آواز میں سحر بھر دیا تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے :- ؎

رات کا خواب الٰہی توبہ آپ سنئے گا تو شرمایئے گا

مشہور فلم سٹار نرگس کی ماں **جدن بائی** اس محفل کی آخری شمع تھی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اس کو مورپنکھی ناچ میں وہ کمال تھا کہ ہر نرت پر دقت ٹھہر کر اس کی اداؤں سے چشم سیر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں طوائفوں نے بعض پیشہ ورانہ اصول وضع کئے اور اپنی معاشرت میں بعض ایسے الفاظ شریک کئے جن سے ان کی معصیت ڈھک گئی۔ مثلاً وہ کسی مرد سے مقررہ مشاہرہ پر زناشوئی کے تعلقات قائم کرتی تھیں تو ان کی اصطلاح میں اس کو ملازمت کہتے تھے، یہ رواج اب بھی ہے۔ ایک طوائف جس مرد سے مشاہرہ پر تعلقات قائم کرتی ہے اس کا بدن اسی کے تصرف میں

رہتا ہے، لیکن رقص و نغمہ کے لئے اُن کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا ہے
یہ تھا نستعلیق لکھنؤ، مگر محمد شاہ رنگیلے کی دہلی کا اخلاقی انحطاط اس سے بھی افزوں تھا۔ نواب درگاہ قلی خاں نے اس عہد کا تذکرہ لکھا اور خواجہ حسن نظامی نے اُس کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ایک اقتباس بہ تصرف ادنیٰ ملاحظہ کیجیے:۔

"جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھیے دہلی کے خوش باش لوگ زندگی کی بہار لُوٹنے میں مشغول ہیں ہر کوچہ و بازار میں حسن و عشق کے معرکے ہیں ہر درخت کی چھاؤں میں عاشق و معشوق رنگ رلیاں کرتے نظر آتے ہیں ہر میدان میں مستوں اور محبوبوں کی ٹولیاں سیریں کرتی اور جھومتی نظر آتی ہیں۔ ہر باغ میں، الغرض حسینوں اور خوش چہرہ لڑکوں اُن کے شیدائیوں اور دلفگاروں کے راز و نیاز کی محفلیں جمی ہوتی ہیں —— یہ رات کے ابتدائی حصے کے منظر ہیں، جب رات زیادہ آجاتی تو بس دہلی والوں میں بھی شباب کی اُمنگیں زور مارنے لگتی ہیں، اور وہ محتسبوں یا راہ گیروں سے بے نیاز ہو کر بے اندیشہ اور بے خطر ہوس رانی میں لگ جاتے ہیں نعط مرد محبوبی اور معشوقی کا کام کرتے ہیں لیکن بعض بعض لوگ اس کو پسند نہیں کرتے وہ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی تلاش میں

میں رہتے ہیں۔ اور یہ کوئی دشوار کام نہیں، کیونکہ اس قسم کی آوارہ عورتیں بکثرت موجود ہوتی ہیں ———"

میرزا کلو ایک آزاد عیش نوجوان ہے، اس کو امیرزادوں اور نوجوانوں کی طبیعت پر قابو ہے، اور ہمیشہ دلجوئی و خاطرداری کے لئے ان کی خواہشوں کو پورا کرتا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ عیش و نشاط کے لوازمات میں کسی چیز کی کوتاہی نہیں کرتا، میرزا مشرف کے عرس پر جب امراء اور ان کے صاحبزادے آتے ہیں تو ہر کوئی اپنے ہمراہ کمسن اور طرار معشوقہ یا نوخط امرد کو لاتا ہے۔ ان کا قیام میرزا کلو کے خیموں میں ہوتا ہے، جو ہر ایک کے لئے الگ الگ فاصلہ پر باغ میں لگے ہوتے ہیں، جس کا جو جی چاہتا ہے، کرتا ہے۔ کوئی محتسب نہیں ہوتا۔ تمام سامان عیش و رندی پہلے سے تیار رہتا ہے۔ ہر ایک معشوق کے ساتھ شراب کے دور چلنے شروع ہو جاتے ہیں پس اس منزل پر پہنچکر نفسانی خواہشات آزادی کے ساتھ پوری کی جاتی ہیں امیر الامراء اعظم خاں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہر خوب صورت عورت اور خوش چہرہ لڑکے کو اپنے حجلۂ ہوس میں لانے کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ میرزا منو امرد پرستی میں یگانۂ روزگار تھا۔ انہی امراء میں ایک خوش باش لطیف خان تھا اس کے

ہاں ہر شب محفل جمتی۔ مغبچے حاضر ہوتے۔ حقے خوشبو میں بسے رہتے۔ ہر ایک کے سامنے گلاب پاش رکھے ہوتے اور تمام مکان رات بھر اندر سبھا بنا رہتا۔ طوائفیں آتیں مجرے ہوتے اور جب تک رات تابہ کمر نہ آ پہنچتی اُس وقت تک بادۂ انگور و بادۂ سخن کا دور چلتا۔ لوگ جرعہ ہائے شراب سے لیکر جرعہ ہائے رخسار تک سے لطف اندوز ہوتے۔ میرن دہلی کا ایک رئیس زادہ تھا جو وزیرالملک کے مزاج میں دخیل ہو گیا تھا۔ اس کا کام وزیرالملک کیلئے خوش چہرہ لڑکوں کی فراہمی تھا اس کے دلال صبح و شام حسینوں کی ٹوہ میں رہتے اور خلوتِ شبینہ کے لیئے خوب صورت لڑکے جمع کرتے وزیرالملک نے اس شوق میں لکھوکھا روپے صرف کیئے۔ جس سے اُس کا محل خوب صورت لڑکوں کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔

محمد شاہ کے ہزاریوں میں کسل سنگھ ایک سردار تھا۔ اُس کے نام پر کسل پورہ آباد تھا۔ جہاں کسبیاں پیشہ کماتی تھیں۔

اربابِ نشاط میں نعمت خاں اور اُس کا بھائی موسیقی میں نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر تھے۔ غلام رسول اور جانی قوالی میں یکتائے روزگار تھے۔ باقر تنبورہ بجانے میں یگانہ تھا۔ خود بادشاہ اُس پر جی جان سے فدا تھا۔ حسن خان رباب بجانے میں

بے مثال تھا۔ غلام محمد سارنگی بجانے میں منفرد تھا کہ بڑے بڑے باکمال اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ قاسم علی، نعمت خاں کا شاگرد تھا۔ اُس کی آواز اور اس کے چہرے میں زبردست کھچاؤ تھا۔ معین الدین اور برہان الدین جادو اثر قوال تھے گھانسی رام پکھاوج میں وحید العصر تھا۔ رحیم خان کو خیال گانے میں ملکہ حاصل تھا۔ شجاعت خان اپنی آواز کے بل پر بادشاہ تک رسائی رکھتا تھا۔ حسن خان ڈھولک بجانے میں بے نظیر تھا اور چھ ماہ تک نت نئی گت کے ساتھ ڈھولک بجا سکتا تھا۔ جب اُس کی انگلیاں ڈھولک پر تیزی اور خوبصورتی سے چمکتیں تو معلوم ہوتا اندھیری رات میں جواہرات یا ستارے جگمگا رہے ہیں اور ارض و سما رقص میں ہیں۔ خواص اور انوٹھا مشہور نقال تھے۔ سبزہ اور زمرد دو نوخیز لڑکے تھے جب ناچتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے چمنستان متحرک ہیں۔

یہ تو مردوں کی خصوصیتیں تھیں۔ عورتوں کے احوال اس سے بھی رسوا تھے۔

معشوقہ ابوالحسن محمد شاہ کی محبوب رقاصہ تھی۔ آواز میں تمکنت لہجہ میں لوچ اور ادا میں رنگینی۔ جو دیکھتا اُسی کا ہو رہتا۔ نور بائی

ڈومنی تھی، لیکن فصیح گفتگو میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس کا مکان ایک
پرصنع دربار تھا۔ ہمیشہ ہاتھی پر سوار ہو کر سیر کو نکلتی چوبدار اور ملازم
محافظ دستہ کی حیثیت میں ہمراہ ہوتے۔ جب امرار بلا بھیجتے تو
قیمتی ہدیے بھیجتے۔ ایک دو نہیں، بیسیوں رئیس اس کے ہاں لٹ
گئے، اچھے اچھوں کی حویلیاں کھد گئیں۔ اس کی معیت میں بہت سی
عورتیں ہوتی تھیں جنھیں بیگم اور خانم کہا جاتا تھا۔ ان سب کا فن روپیہ
کھینچنا تھا۔ اور کئی قارونی جیبیں اُن کی بدولت خالی ہو چکی تھیں۔
امیر بیگم ایک عجیب الخلقت طوائف تھی، اس کا کمال یہ تھا کہ
مجلسوں میں برہنہ آتی تو ہر حصہ عریاں ہوتا۔ لیکن اس انداز میں پاجامے
کی نقاشی کرواتی جیسے کمخواب کا بیلدار پاجامہ پہن رکھا ہو۔ اس عریانی
کو ہر کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ تمام لوگ ملبس ہی سمجھتے تھے عماد الدولہ
کی داشتہ کا نام رام رجنی تھا۔ زینت اور گلاب بڑے پایہ
کی ڈیرہ دارنیاں تھیں۔ ان کے دروازے پر دستک دینا ہر کسی
کے بس سے باہر تھا۔ رحمان بائی محض رقاصہ تھی، لیکن پیکر بدن
ایسا تھا جیسے شام کشمیر مجسم ہو گئی ہو۔ پنا بائی کی آواز میں وہ سحر تھا
کہ زندے تڑپ اٹھتے اور مُردے جی جاتے تھے۔ اس نے بہت
سی راگنیاں بھی تخلیق کی تھیں۔ پانی پر لکیر کھینچنا اور ہوا میں گرہ لگانا

اُس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ کماں بائی درباری مغنیہ تھی۔ کنورا بائی کی بیٹی کا نام امداباں بائی تھا۔ اُس کا دامن گلدستہ تھا۔ جہاں اُس کی ماں کا حُسن ختم ہوتا وہاں سے اُس کا حُسن شروع ہوتا تھا۔ پنّا اور تنّو محمد شاہ کی منہ چڑھی طوائفیں تھیں۔ جب محمد شاہ نے نادر شاہ کی لُوٹ سے دل برداشتہ ہوکر اربابِ نشاط کو چھٹی دے دی تو یہ دونوں بالاخانوں پر آبیٹھیں جہاں ہر شب مغل شہزادے اپنی صبحِ انجام کو قریب لاتے تھے ------!

ادھر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر جو قیامت ٹوٹی اُس سے پرانی ثقافت کے درو دیوار تک ہل گئے۔ تمام ملک بارہ باٹ ہوگیا۔ وہ لوگ جن کے ہاں بادشاہوں کے دسترخوان بچھتے تھے۔ اب روزی کی الیسیٹ میں مر رہے تھے۔ جنھوں نے کبھی کسی کا ہاتھ نہ تکا تھا۔ اُن کے دامن کشکول ہو گئے اور اب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پیٹ کی دہائی دے رہے تھے۔ ادھر خاندانی شرافت فقیر کی گدڑی ہوگئی۔ ادھر ہر کوئی بے نوا کا سونا بنا پھرتا تھا۔ جن چہروں پر دہلی و لکھنؤ کی شرافت کا انحصار تھا وہ تتر بتر ہو گئے۔ ہر شے پر جھوٹا جھول چڑھنے لگا۔ شرفا کی لاج لُچّوں کا قہقہہ بن گئی۔ اور دیکھتی آنکھوں ایسا انقلاب برپا ہوگیا۔ کہ تیمور و بابر کی بیٹیاں تن ڈھانپنے کیلئے چیتھڑے ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ ہر بڑی تبدیلی اپنے ساتھ کچھ برگ و بار لاتی ہے۔ اور اس پر تاریخِ فحاشی شاہد ہے کہ کسبیوں کا وجود جنگ یا مہاجرت ہی کی

آب وہوا میں پنپتا اور بڑھتا ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ انحطاط میں اس کا اعتراف موجود ہے اور خود برصغیر ہندوستان کی تقسیم اس کی تازہ شہادت ہے۔ پچھلی دو بڑی جنگوں میں جو کچھ ہوتا رہا۔ وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ اس مادی تباہی سے قطع نظر، جو یورپ میں اپنے خطرناک نتائج چھوڑ گئی۔ سب سے بڑا سانحہ وہ اخلاقی تباہی ہے جس سے عورت ایک جنس بن چکی ہے۔ پچھلی جنگ میں آسام کی سرحد پر ایک غیور قوم موگ نے قحط کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور جب بھوک کا تقاضا شدید ہو گیا۔ تو موگ عورتوں نے اتحادی سپاہیوں کے ہاتھوں اپنا جوہرِ عصمت بیچ ڈالا۔ جو بہر حال روٹی کا بدل تھا ——— روٹی ——— اور عصمت۔

۱۸۵۷ء کا سانحہ بھی اپنے ساتھ اپنے ضروری نتائج لایا۔ جب تاج و تخت چھن گئے تو ان کی وابستگیاں بھی جاتی رہیں۔ معاشرہ کا معاشرہ تہس نہس ہو گیا۔ وہ رنڈیاں جن سے شرفا کے بچے آدابِ مجلس سیکھتے تھے۔ شمع راہگذار ہو گئیں۔ جن کی زبان میں کوئی لچک نہ تھی۔ اس طرح اٹھتی گئیں کہ معیاری طوائف کا تصور بتاشہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے برعکس بازاریوں میں حیرتناک اضافہ ہو گیا۔ اور وہ خرابیں جو اس پیشہ کے آداب سے ناواقف تھیں یہاں تک آمادہ ہو گئیں کہ وہ جسم کو گوشت کے بھاؤ بیچنے لگیں۔ وضعداری کے تمام سانچے ٹوٹ گئے۔ مولانا شبلی کے ایک طنزیہ سوال پر سرسید نے کہا تھا۔ اس زمانے کے لوگ واقعی اپنے

دوست کی داشتہ کو بھاوج کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خود طوائف کا یہ حال ہوتا
تھا کہ جس سے ایک دفعہ تعلق ہو جاتا اُس سے عمر بھر ناطہ نہ ٹوٹتا۔

تھوڑے ہی دنوں میں غدر کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور استعمار انگریزی کی مصلحتوں
نے ریاستوں کے وجود کو برقرار رکھا تو ریاستیں طوائفیت کی چھتنیاں ہو گئیں چنانچہ
غدر کے بعد طوائفوں کے ادارہ کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں ہاتھ نوابوں،
مہاراجوں، خانوں، تعلقداروں اور زمینداروں کا ہے۔ اس برصغیر میں
طوائف کا موجودہ نظام براہ راست جاگیرداروں کی پیداوار ہے اور جو تکلف، تصنع
استحصال اور تلون جاگیرداری نظام کی خلقی خصوصیت ہے وہی خصوصیت ایک
طوائف کی سیرت کا پرتو ہے۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ——— ۵۶۲ ریاستیں تھیں۔ سب سے
بڑی حیدر آباد، جہاں پونے دو کروڑ لوگ بستے ہیں! اور سب سے چھوٹی بلباری جس
کی آبادی صرف ۲۷ نفوس پر مشتمل ہے۔ ان سب ریاستوں کے رگ و ریشہ میں
(الاماشاءاللہ) طوائف کا خون دوڑتا رہا۔ ان میں سے بیشتر کے
فرمانروا اپنے اب وجد کی دعا برکت سے طوائفوں ہی کی اولاد ہیں۔ اور ان کا
خمیر و ضمیر طوائف ہی کی مٹی میں گندھا ہوا ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے
کہ طوائف کا ادارہ جاگیرداروں ہی کی وجہ سے پروان چڑھا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں
میں کسبیاں پلتی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بکتی ہیں۔ ان ریاستوں کے گھناؤنے

نظام ہی کے باعث بردہ فروشی محو نہیں ہوئی۔ پنجاب میں چمبہ کا علاقہ خوبصورت لڑکیوں کی فروخت کے لئے کافی مشہور تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے والد کی تین سو سے زائد بیویوں کو ۳۵ روپے فی نفر کے حساب سے فروخت کیا تھا۔ ہندوستان میں بہت سے راجے اور نواب ایسے تھے جو بیک وقت بیٹی اور ماں سے مستفید ہوتے رہے۔ خود مجھے ایک طوائف نے عندالملاقات بتایا کہ ریاستوں میں گورا رنگ اور سرمئی آنکھیں ہمیشہ راجواڑوں کی ملکیت سمجھی گئی ہیں۔ مشہور کہاوت ہے کہ :-

"ریاستوں میں خوب صورت لڑکیاں ترقی حاصل کرنے کے لئے جنی جاتی ہیں۔"

ایک انگریز افسر نے جو ریاستی محکمہ میں کام کر چکا تھا۔ اپنے ایک مراسلہ میں برطانوی حکومت کو لکھا تھا کہ ریاستی افسروں کا صرف ایک ہی کام ہے کہ وہ حکمرانوں کے لئے عورتیں اغوا کرتے ہیں۔

ایک مہارانی نے 'بمبئی کرانیکل' میں رنواس کا کچا چٹھا لکھتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ :-

"ہم محض بستروں کے کھلونے ہیں۔ ہماری زندگی یا موت کا انحصار مالکوں کی مرضی پر ہے۔ ہماری زندگی بھیانک خوابوں سے ابتر ہے۔ ہمارے حرم مرصع پنجرے ہیں۔ جہاں ہمیں قید رکھا جاتا ہے ________"

چنانچہ راجپوتانہ کے ایک مہاراجہ اپنے پیچھے چار ہزار عورتیں چھوڑ کر گئے تھے! اور ان میں بے شمار نابالغہ تھیں۔ اس شہوانی جذبے کی تسکین کے لئے ان حکمرانوں کے محلوں میں باقاعدہ عشرت کدے تعمیر ہوتے۔ جن میں اس قسم کے آئینے آویزاں ہوتے تھے کہ ان سے اختلاط کے مختلف زاویوں کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اندور کو محض اس جرم کی پاداش میں گدی چھوڑنی پڑی کہ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی داشتہ موراں کی پڑپوتی ممتاز سے تعلق قائم کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد ممتاز کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ بھاگ گئی۔ مہاراجہ کے ملازموں نے پیچھا کیا۔ لیکن ممتاز نے بمبئی کے ایک کروڑ پتی سیٹھ باولے سے نکاح پڑھا لیا۔ مہاراجہ کے ملازموں نے موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر ڈالا اور کوشش کی کہ ممتاز کو اٹھا لیں مگر سب کے سب موقع پر گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا ——

اور بالآخر مہاراج ادھیراج کا سنگھاسن ڈول گیا —— !

ان اُلٹے تلوں کی بنیاد ہی پر ایک مصنف نے کہا تھا:۔

"ہر انسان مختلف طریقوں سے دن کا آغاز کرتا ہے، انگریز انڈے اور سور کے گوشت سے، جرمن ساسیج اور قیمہ سے، امریکن انگور سے، مگر "ہز ہائی نس" دوشیزہ کو ترجیح دیتے ہیں —— !"

گوشت ہی گوشت

"اے پستیاز رتشترا! یہ گاہی (کسبی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین یعنی بُرے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے، اس کی نگاہ اس عظیم سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے آتا ہے ایک ثلث خشک کر دیتی اور ایک ثلث طلائی پودوں کو مرجھا دیتی ہے، اس کے لمس سے مومن کے نیک خیالات، پسندیدہ اقوال، حسنہ اعمال، جسمانی طاقت، قوائے فتحمندی اور روحانی تقدس کا ایک تہائی خاک میں مل جاتا ہے۔"

(اوستا تشت پیغمبر!)

لاہور کا موجودہ چکلہ بوڑھے راوی کا ہم عمر ہے اور شہر کے قلب میں واقع ہے۔ چکلہ کی جوانی اور راوی کی روانی میں کبھی فرق نہیں آیا، دونوں سدا سہاگن ہیں؛ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانۂ انحطاط سے اس کو آغاز ہوتا ہے، اس سے پیشتر بازار چوک چکلہ ہے رسالہ بازار تک، جس میں نئی اور پرانی انار کلی کا علاقہ شامل

ہے۔ کسبیاں بیٹھا کرتی تھیں، اردگرد مغلوں کی سرکاری عمارتیں یا اُن کے کھنڈر تھے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں، شہر لاہور کا نصف چکلہ تھا۔ ممکن ہے رنڈیوں کی اس بہتات کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ لاہور ہمیشہ سے فوجوں کی گذرگاہ رہا جب غیر ملکی حملہ آور خیبر پار سے ہندوستان میں داخل ہوتے تو اُن کا پہلا پڑاؤ لاہور ہی ہوتا اس کے علاوہ، سندھ، سرحد اور دہلی کے فوجیوں نے بھی لاہور کو جولانگاہ بنائے رکھا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شہر فوج کی زد میں ہو تو اُس کی دولت ہی نہیں لٹتی بلکہ عصمت بھی لٹتی ہے۔ **فاتحین چکلے بناتے اور مفتوحین کسبیاں جنتے ہیں۔**

برصغیر ہند و پاک کے چار بڑے چکلوں میں لاہور کا چکلہ چوتھے درجے پر ہے۔ اقوام متحدہ کی ثقافتی کمیٹی نے مختلف ملکوں کی کسبیوں کے جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں، اس حساب سے، پہلے نمبر پر کلکتہ ہے، دُوسرے پر بنگلور، تیسرا بمبئی، اور چوتھا لاہور۔

حکومتِ پاکستان نے اعداد و شمار مہیا کرنے سے معذوری ظاہر کی ہے لیکن قیاسی موازنہ سے لاہور کا درجہ چوتھا ہے، کلکتہ میں ایک لاکھ سے زائد رنڈیاں ہیں مگر اُن میں پچانوے فی صد کے لگ بھگ ٹکیائیاں ہیں جو روٹی پر عصمت بیچتی ہیں، جس ادارہ کا نام طوائف ہے، وہ یا تو لکھنؤ میں رہا یا آگرہ میں، یا دہلی میں، اور پھر لاہور میں، اور اب لاہور ہی ڈیرہ دارنیوں کا بڑا

مرکز ہے۔

لاہور کا بازار، عام بازاروں کے طرز پر نہیں کئی بازاروں اور کئی محلوں کے ادغام سے ایک بڑے قصبہ کے برابر ہے۔ تمام علاقہ کو منفرداً ہیرامنڈی کہتے ہیں۔ اس کی سطح لاہور کے ہر حصہ سے بلند ہے۔ اگر راوی کا پانی پار کرتا ہوا اس سطح تک آجائے تو نہ صرف لاہور غرق ہو جاتا ہے، بلکہ ملتان تک کا علاقہ ڈوب جاتا ہے۔

ہیرامنڈی رقص کے ایک تکونی زاویے کی طرح ہے، عالمگیری مسجد اور اکبری قلعہ کے بائیں سمت بالاخانوں کی ایک دور تک پھیلی ہوئی قطار ہے، جس میں کئی ٹیڑھی ترچھی قطاریں ضم ہوتی ہیں، ٹکسالی دروازہ سے داخل ہوں تو سب سے پہلے نکڑ پر شاہی وقتوں کی یک منزلہ مسجد ہے، جس کے چہرے پر برص کے داغ ہیں، —— سیاہ دیواروں میں سفید دھبے —— اسکی تعمیر مغلئی طرز پر ہے۔ اس مسجد سے چند ہی قدم آگے رنڈیوں کے کوٹھے شروع ہو جاتے ہیں۔ بازار شیخوپوریاں کے وسط سے، محلہ تمیاں کو جو راستہ جاتا ہے، اس کی دو یا چار دکانیں چھوڑ کر ایک گلی مڑتی ہے۔ جس کو ٹبی کہتے ہیں۔ یہ ایک بازار نما کوچہ ہے۔ جس کا دوسرا سرا بازار حکیماں کے آغاز پر ختم ہوتا ہے۔ ایک پہلو میں بازار جج عبداللطیف ہے دوسرا موڑ ٹبی تھانے کے ساتھ سے ہو کر گزرتا ہے۔ ٹھیک وسط میں گیٹی تھئیٹر کا چوک ہے جہاں، بازار شیخوپوریاں

چیت رام روڈ، شاہی محلہ، ہیرا منڈی، بارود خانہ کا عقبی حصہ اور اڈہ شہباز خاں، ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔

اس فضا کے صحیح تماشائی اورنگ زیب کی مسجد ـــــ یا کعبہ کی بیٹی کے وہ بلند قامت مینار ہیں جو سالہا سال سے انسان کی بیٹی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ـــــــــ ؟

ٹبی ایک دندانہ دار کوچہ ہے، اس کے اوپر نیچے دوکانیں اور مکانیں ہیں جہاں ہر رنگ اور ہر عمر کی عورتیں بھری پڑی ہیں،

یہ بازار نہیں، ایک سنگین بستر ہے، جہاں عورت کی عصمت تھک کر ہمیشہ کی نیند سو گئی ہے، اس بوچڑ خانہ میں عورت قتل ہوتی ہے، اس کا گوشت بکتا ہے، عورت کا گوشت ـــــ بیسے کا گوشت ـــــ دوشیزہ کا گوشت ـــ بڑہ کا گوشت ـــــ باکرہ کا گوشت ـــــ آہو کا گوشت ـــــ ٹیار کا گوشت ـــــ گائے کا گوشت ـــــ ہیر کا گوشت، سوہنی کا گوشت، صاحباں کا گوشت، سدا سہاگنوں کا گوشت ـــــ ان سہاگنوں کا گوشت، جو سہاگ رات ہی میں بیوہ ہو جاتی ہیں کسی بھی گاہک کے لئے کوئی قید نہیں، ہر بوٹی کی قیمت مقرر ہے، آٹھ آنے سے تین روپے تک ـــــ آپ نے دام پوچھے اور پھر جیسا گوشت چاہا خرید لیا، تازہ، باسی، جوان، بوڑھا، سرخ، سفید، گوشت ہی گوشت،

جسم ہی جسم! ——— ؟

آپ کی چاندی اور عورت کی چمڑی، اِس منڈی کا اصل الاصول ہے ہمیشہ دساور سے تازہ مال آتا کچھ دِنوں ان دو کانوں پہ لٹکتا اور پھر باسی ہو جاتا ہے۔

بازار نہیں ——— بوچڑ خانہ ——— عورتیں نہیں ——— بھیڑیں!!

اِس پیچدار مارکیٹ میں کہیں، اور کوئی سیدھ نہیں، تمام "بازار" ہیں جوڑ ہی جوڑ ہیں۔ وسط میں ایک چھوٹا سا چوک ہے ——— مُلّا کے دماغ کی طرح سپاٹ، غربی حصّہ میں ایک کٹڑی ہے، ——— صُوفی کے عمامے کی طرح پیچدار ——— اور کٹڑی سے ایک طرف کونا موڑ ہے۔ جہاں حضرت سید قاسم شاہ مشہدیؒ کا مزار واقع ہے۔ اس مزار کے پہلو میں مسجد ہے، مسجد کے دروازے پر عموماً تالا پڑا رہتا ہے۔ متولی کا کہنا ہے کہ جو لوگ چوری چھپے آتے ہیں وہ حضرت سید قاسم شاہؒ کے مزار کی دیوار کا سہارا لیکر مسجد کے عقب سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن بعض بعض مسجد کی اہانت کو محسوس نہیں کرتے اور اُسی کو چور دروازہ بنا لیتے ہیں۔

حضرت سید قاسم شاہؒ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں مشہد سے لاہور تشریف لائے تھے اور اسی جگہ قیام فرمایا جہاں دفن ہیں مزار کے پڑوس میں ایک کھُلے صحن کا مکان ہے جس کا چوبی دروازہ اندر سے بند

رہتا ہے، اسید اولاد شاہ گیلانی ایم اے جو آپ کی پوتی کے بیٹے ہیں۔ اِس مکان میں رہتے ہیں، شاہ صاحب مدرس رہ چکے ہیں تقریباً بیس سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان میں سیکریٹری رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ٹبّی اسم تصغیر ہے۔ ابتدا میں اس جگہ ٹبہ (ٹیلا) ہوتا تھا، حضرت قاسم نے اس کو اقامت و عبادت کے لیے چن لیا مسجد کی نیو رکھی حجرہ بنوایا اور یاد اللہ میں مشغول ہو گئے تھوڑے ہی دنوں میں اُن کے فقر و استغنا کا چرچا ہو گیا۔

انھی دنوں چیچو کی ملیاں (شیخوپورہ) کے بعض خانہ بدوشوں نے ٹبی کے نشیب میں قیام کیا یہ لوگ خود کو جاٹ، چھیمہ، اور ورک کہتے تھے ان کا کام چٹائیاں بُننا اور چھتیں بنانا تھا۔ لیکن پیٹ کی مار، صورتوں کے ساتھ سیرتیں بگاڑ دیتی ہے۔ ان کی عورتیں خوب صورت تھیں ان سے چوری چھپے پیشہ کمانا شروع کیا۔ حضرت قاسم شاہ کے فرزند حضرت میراں شاہ جو اُس وقت دس گیارہ برس کی عمر میں تھے۔ ان کی جھونپڑیوں میں شب کو گھس جاتے، دیئے گُل کر دیتے اور چلّاتے :۔

سور آ گئے سور، سور آ گئے سور،

اس پر چند لوگ حضرت قاسم شاہ کی خدمت میں پہنچے، اور مرشد زادے کی شکایت کی، شاہ صاحب نے فرمایا :۔

میبرن! ان کے لئے دعا کرو، بددعا نہ دو، سو بھی تو خدا کی مخلوق ہے؛ ان خانہ بدوشوں ہی کی اولاد ہیرا منڈی کے پشتینی گھنوں کی وارث ہے، اور اُن کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں۔

جب حضرت میرن شاہ کا ۱۲۷۸ھ میں وصال ہو گیا تو ٹبی کا نام کوچہ میرن شاہ رکھا گیا۔ لیکن ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں پولیس کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ علی گوہر نے، اپنے نام سے منسوب کر لیا، وہ انتقال کر گیا تو کوچہ گاڈیاں کہلایا، اب ٹبی یا چکلہ کہتے ہیں۔

ہر سال عرس کے موقع پر، پشتینی رنڈیاں حضرت قاسم شاہ کے مزار پر حاضر ہوتی اور مجرا کرتی ہیں۔ انہی حضرت قاسم شاہ کے برادر زادے حضرت علامہ میر حسن سیالکوٹی، علامہ اقبالؒ کے اُستاد تھے، علامہ میر حسن کے دو بیٹے تھے۔ نقی شاہ اور تقی شاہ۔ نقی شاہ سے علامہ اقبالؒ کے دوستانہ مراسم تھے، امروز کے اقبال نمبر میں نقی شاہ کے نام، علامہ اقبالؒ کے جس خط کا عکس چھپا تھا اُس میں امیر کا ذکر تھا، امیر ایک نامور طوائف ہوتی ہے ——— !

ٹبی میں کوئی دو سو کے لگ بھگ دوکانیں، مکانیں[1] یا ڈربے ہیں جہاں

---

[1] قواعد کی رُو سے مکان کی جمع مکانیں غلط ہے، لیکن مجھے اس میں ایک خوبی نظر آتی ہے۔

کوئی چار ساڑھے چار سو کے قریب عورتیں بیٹھتی ہیں۔ ان کا کام صرف جسم فروشی ہے کیونکہ عصمت نام کی کوئی چیز بھی وہاں نہیں ہے۔ ان کی دوکانیں صبح بارہ بجے کھلتی اور رات بارہ بجے بند ہو جاتی ہیں، ان سے بات چیت کی راہ پیدا کرنا بڑا کٹھن ہے، ان کے ٹھیکیدار یا اُن کے گماشتے سر پر کھڑے رہتے ہیں، قیمت پوچھئے روپیہ مٹھی میں تھمائیے، چارپائی بچھی ہے، آپ پندرہ منٹ سے زیادہ مہلت نہیں لے سکتے، دیر لگی، تو کھِسیائی کی خیر نہیں ان کے مالکوں کو اصلیت کے کھلنے کا ڈر لگا رہتا ہے، مبادا بوچڑ خانہ کا راز افشا ہو یا وہی ہاتھ سے نکل جائے

الغرض ایک عجیب ماحول ہے،

عورتیں کیا ہیں ؟ تاش کے پتے ہیں، چوسر کی نردیں ہیں، آم کی گٹھلیاں ہیں، کیلے کا چھلکا ہیں، خربوزے کی پھانک ہیں، گنے کی پوریں ہیں، سگرٹ کا دھواں ہیں، عورت نہیں ——— شارع عام ہیں۔ ان کا وجود ایک خوفناک قہقہہ ہے، ایک عریاں گالی ہے، ایک سنگین احتجاج ہے، ایک اوپن ایر تھیٹر ہے، ایک سرکاری کمونک ہے، ———

علمار سے معذرت کے ساتھ ——— ایک عوامی شاہکار ہے،

اُن فرزندانِ سلطنت کے لئے، جو اہل قلم سے بے نیاز ہیں،

عورتیں نہیں ——— قبریں

عورتیں نہیں ——— چتائیں

عورتیں نہیں ——— ہچکیاں

عورتیں نہیں ——— آنسو

فطرت کے آنسو، انسان کے آنسو، عورت کے آنسو، خون کے آنسو،

آنسو ہی آنسو، ——— ح

آدمی محسوس کرتا ہے خدا خاموش ہے،

ٹبی سے باہر بازار شیخوپوریاں ہے، ہیرامنڈی کے چوک تک بکھیل منڈیول کی مکانیں یا دوکانیں ہیں، ان میں بعض نے کوٹھی خانے کھول رکھے ہیں، بعض نے ضرورتاً آلات موسیقی رکھ چھوڑے ہیں اور بعض واقعی گویا ہیں چیت رام روڈ کی دوکانوں میں اوسط درجے کی گویا بیٹھتی ہیں، اور مکانوں میں دو چار پشینی کنجنیوں کے سوا تقریباً سب بستر کی چیزیں ہیں اس علاقہ کا سب سے بڑا چودھری سیالکوٹ کا باشندہ ہے، اس کے تصرف میں کوئی درجن ڈیڑھ درجن لڑکیاں ہیں، چودھری کی روزانہ آمدنی چار سوا چار سو روپیہ سے بڑھکر ہے اس کے پاس رائفل ہے گولیاں ہیں کار ہے۔ سواریاں ہیں تانگہ ہے گھوڑیاں ہیں روپیہ ہے اثر ہے ——— رسوخ ہے الغرض سبھی کچھ ہے اس لئے کہ لڑکیاں ہیں،

شاہی محلہ کی مختلف ٹکڑیوں میں بہت سے کوٹھی خانے ہیں، ایک طرف ڈینٹل ہسپتال کے نکڑ پر دوسری طرف شاہی مسجد کو نکلتے ہوئے

چوک میں، بہت سے نوجوان کھڑے رہتے ہیں ان کا کام دلالی ہے، کاریں آتی ہیں کھسر پھسر ہوتی ہے سودا چکتا ہے اور جسم لے کر نکل جاتی ہیں،

ہیرا منڈی کے چوک سے کوچہ شہباز خاں کے آخری سرے تک پشتینی کنچنیوں کے مکانات ہیں۔ کچھ خاندانی رنڈیاں مدرسہ نعمانیہ کے آس پاس رہتی ہیں، اکثر مر کھپ چکی ہیں۔ بعض کی اولاد بڑے بڑوں کے گھر میں اٹھ گئی ہے، اور بعض ابھی تک پرانے ڈگر پر چل رہی ہیں،

ہیرا منڈی اور ٹبی بازار میں بڑا فرق ہے، ٹبی محض قصاب خانہ ہے، ہیرا منڈی تصویر خانہ یہ ایک آرٹ گیلری ہے، یہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں، اس علاقہ کے بالاخانوں میں دن ڈھلے قحبہ انگڑائیاں لیکر اٹھ بیٹھتی ہیں، ناچ کمروں کی صفائی شروع ہو جاتی ہے اور رات کی پہلی کروٹ کے ساتھ ہی بازار جگمگانے لگتا ہے، کوئی نو بجے شب کو دروازے کھل جاتے ہیں، ہر بیٹھک کی تیاری مکمل ہو چکتی ہے، ہر کوئی آجا سکتا ہے، لیکن ان بالاخانوں میں جانے کے لیئے روپیہ اور ہمت کی ضرورت ہے، کئی حویلیاں نسلی کنچنوں کی ہیں، ان کے کاروبار کا بھی زور ہے یہ لوگ مالدار ہیں ہر ایرا غیرا ان کے ہاں قدم نہیں رکھ سکتا، ان کے ٹھاٹھ شاہانہ ہوتے ہیں، اُن کے "جسم" شاہی ہیں، اُن کی محلسرائیں جدید و قدیم کے امتزاج کا نمونہ ہیں، ڈرائنگ روم ہیں، قد آدم سنگار میزیں ہیں، شیشہ

کی الماریاں ہیں، خاصہ خانے ہیں صوفہ سیٹ ہیں، خلوت خانے ہیں، قالین ہیں، ڈوریوں سے کسے ہوئے پلنگ ہیں، فرش پر بچھی ہوئی ستھری چاندنی ہے چاندی کے نقشی باندان ہیں، پھولدار اگالدان ہیں مغلئی حقے ہیں، دیواروں پر جلبی آئینے ہیں اوپر چھت گیریاں ہیں اور وسط میں جھاڑ ہیں ——— !

ایک طرف میراثی، ساز لئے بیٹھے رہتے ہیں، جب تک گاہک آئیں کبھی تاناری ری کرتے، کبھی آپس میں پھبتیاں کستے، کبھی لطیفے جھاڑتے، اور کبھی حقے پیتے ہیں، ان کی شکلیں، عجیب ہوتی ہیں ہر کوئی گھن لگا ایندھن ہے اکثر جواری ڈھنڈاری ہیں جو کچھ رات کو کماتے دن کو ہار دیتے ہیں، خرانٹ صورت ہیں، چرکٹے ہیں، نٹ کھٹ ہیں چرغٹو ہیں اول جلول ہیں لیکن ہیں آٹھوں گانٹھ کمیت، انہیں رنڈیوں کے لاحقے اور سابقے کا نام دینا زیادہ بہتر ہے، عام گنوار ہیں انہیں اُستاد جی کہتی ہیں، فطرت نے رنڈی کے چہرے سے حیا اور میراثی کے چہرے سے رونق دونو چھین رکھی ہیں۔

جب شوقین مزاج آتے ہیں تو یہ ایک نظر میں اُن کا جائزہ لیتے ہیں ان کا قیافہ عموماً درست ہوتا ہے کوئی مالدار ہو تو اُن کی آنکھیں شکرانہ پڑھتی نظر آتی ہیں۔ ان کے چہروں کا اُتار چڑھاؤ گاہک کی جیب پر ہوتا ہے۔

وزنی جیب، مریل جسم، طبلہ کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھُن چھُن، سارنگی کا لہرا، باجے کی گمک، آواز کا شعلہ، غرضیکہ ہر شئے سُروں میں گھٹی ہوتی ہے گاہک آتے اور جاتے ہیں، جب کوئی آتا ہے تو کواڑ بند ہو جاتے ہیں، نہیں تو کھُلے رہتے ہیں۔ کواڑ کھلے ہوں، تو کسبیاں بھی کھلی ہوتی ہیں، کچھ فلمی رسالے یا جنسی ناول پڑھتی ہیں، کچھ گاہکوں کی راہ تکتی ہیں، کچھ سگرٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولوں میں ان اجنبی مردوں کا تصور باندھتی ہیں جو انہیں کھلونا سمجھتے ہیں، اور جنہیں یہ کھلونا سمجھتی ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی یاد کی ٹیس چھوڑ جاتے ہیں، ان کے والدین ان کے ساتھ رہتے ہیں، بعض ماں باپ کی چہیتی بیٹیاں ہیں ان کی کمائی سے پورا خاندان پلتا ہے،

جب رات ذرا اور گہری ہو جاتی ہے تو شاہی محلہ کی اندھیری گپھاؤں اور قلعہ کی سیڑھیوں کے نشیبی دوراہہ پر طرح طرح کی کاریں آکر رُک جاتی ہیں، اور اُس وقت تک کھڑی رہتی ہیں جب تک عشق کے ساز ٹوٹ نہیں جاتے اور حسن کی موتیا کھلا نہیں جاتی یا جب تک "سوہنی" کا جسم تھک نہیں جاتا اور مہینوال کی ہمت ٹھٹھر کر یخ بستہ نہیں ہو جاتی بعض کن رسیے محض دیوار کے سہارے کھڑے رہتے اور کبھی کبھار ان کی سایہ دیوار ہی میں رات بسر ہو جاتی ہے ——————!

اور جب ہر طرف بکھری ہوئی مسجدوں کے میناروں سے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کی آواز گونجتی ہے تو خانزادوں کی رنگارنگ کاریں بھیرویں میں سارے گاما پادھانی گاتے ہوئے بگٹٹ ہو جاتی ہیں اور اُن کے تعاقب میں کتوں کے "مدھر گیت" دُور تک چلے جاتے ہیں۔

سُورج جاگتا ہے، قصبہ سو جاتی ہے، اور اگر کچھ رہ جاتا ہے، تو حکایتِ شبینہ کے غیر مرئی حروف جن سے چہروں پر ایک تھکن سی ہوتی ہے۔

بازار کیا ہے؟ لالہ زار ہے، ہر شاخچہ کی کونپلیں شبنم سے نہیں سیم سے کھلتی ہیں، انہیں دن کی چمک سلا دیتی اور رات کی کھنک جگا دیتی ہے ان میں سے بعض عورتیں اناروں کے کنج ہیں کہ دانہ دانہ پر مہر لگی ہے، بعض انگوروں کا گچھا ہیں کہ رندوں کا حلقہ نچوڑتا ہے، بعض گؤوں کا چونا ہیں کہ گوالے دودھ دوہتے ہیں، بعض کیلوں کی گہل ہیں کہ شوقین مزاج گودا کھا جاتے اور چھلکا پھینک دیتے ہیں، بعض روٹیوں کی نفسیٔ ہیں کہ نفسی بھوکے ڈٹے پڑتے ہیں اور بعض پانوں کی ڈھولی ہیں کہ بانکے پتیاں چباتے اور چباتے ہی چلے جاتے ہیں۔

عورتیں نہیں ——— ساز کی دُھن، طبلہ کی تھاپ، رقص کا زاویہ، اور بستر کی تنہائی۔

ڈربے

گرم پانی کا پیالہ جو دوپہر کی تیز لُو میں کسی پیاسے کو دیا جاتا ہے،

______؛ (عجمی شاعر)

چکلہ میں، اوپر نیچے ٹکیائیاں ہی ٹکیائیاں ہیں ——— سستی عورتیں، اُن کی دوکانیں، دوپہر کو کھلتی اور رات گئے بند ہو جاتی ہیں ——— بارہ بجے دن سے بارہ بجے رات تک ——— (یہ وقت پولیس کا مقرر کیا ہوا ہے) اِدھر اُدھر لفندرے پھیرے پھاڑتے نظر آتے ہیں، شفق ڈھلتی ہے، تو بازار کی چہل پہل بھی بڑھ جاتی ہے، تمام دوکانیں ہنڈولوں سے جگمگانے لگتی ہیں کہیں، سو کینڈل پاور کے بلب لٹکتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں سرخ لالٹین بیکی کے دمِ واپسیں کی طرح جھلملاتی نظر آتی ہیں، بازار کا بھاؤ دو سے تین روپے تک ہے لیکن کہیں کہیں کوئی جسم آٹھ آنے میں بھی مل جاتا ہے، ان میں زیادہ تر اٹک پار کی عورتیں ہیں جو سب کے سب پشاوری

حقّے کے کش لگاتی ہیں، پنجاب کی عورتیں لگاتار سگریٹ پیتی ہیں، جب رات اور بڑھ جاتی ہے، تو ہر عمر کے تماشائی پلے پڑتے ہیں، ایک ہجوم در آتا ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے، ان کے قہقہے اور تماشائیوں کے آوازے یا پھر اُن کے آوازے اور تماشائیوں کے قہقہے یکساں گونجتے ہیں، کچھ منچلے گالیاں لڑھکاتے اور گالیاں کھاتے ہیں، ہر دریچہ کے باہر ٹھیکیدار یا اُن کا گماشتہ کھڑا رہتا یا ٹہلتا ہے، جب سودا ہو چکتا ہے تو اندر سے کنڈی لگ جاتی ہے، قیمت یا تو گماشتہ اُسی وقت لے لیتا ہے، یا ٹکیائی منقفل صندوقچی میں ڈال دیتی ہے، گاہک پردے کے پیچھے تو ٹنگ پر چلا جاتا ہے اور وہ بدنصیب گرہ کھولنے سے پہلے بخشیش مانگتی ہے، حسن کے نام پر، جسم کے نام پر، خدا کے نام پر، رسُول کے نام پر، کوئی خدا ترس اگر اُس کے ہاتھ میں چونی یا اٹھنی رکھ دیتا ہے، تو وہ شکریہ کے لہجہ میں کہتی ہے دیکھو! وہ خان جو باہر بیٹھا ہے اُس سے نہ کہنا مجھ سے چھین لیگا اس مرحلے میں کبھی کبھار اُس کی عورت جاگ اٹھتی ہے، اُس کی رُوح کے کھنڈر کو کریدنے سے لہو کے جو ذرے اُبھرتے ہیں، ان میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہے عورت ہوتی ہے، ماں ہوتی ہے، بہن ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، بیٹی ہوتی ہے — ان کے ہونٹ ہلتے نہیں لیکن پکارتے ضرور ہیں

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست
ع

"آؤ بابو"

"آؤ جی"

"دو روپے"

"جی نہیں پانچ"

"ڈھائی"

"تو وہ لالٹین کے نیچے مونڈھے پر کلسری بیٹھی ہے، روپیہ میں بھی مہنگی نہیں تشریف لے جائیے۔"

"اچھا تین روپے"

"آجاؤ"

اور پھر چاروں طرف کھڑکیوں کے آمنے سامنے بھیڑ ہی بھیڑ کہیں گالی، کہیں قہقہہ، کہیں طنز، کہیں تضحیک، کہیں پھبتی، کہیں ٹھٹھا، کہیں دھول کہیں دھپا، کہیں فلمی شعر اور کہیں فلمی فقرے، کواڑ کھلا ہے کواڑ بند ہے، ایک آرہا ہے، ایک جا رہا ہے، بیسیوں مرد ایک عورت، ——— چند عورتیں، ——— سینکڑوں مرد، ایک گاہک دوسرا گاہک، تیسرا گاہک، گاہک پہ گاہک، گوریوں کے زیادہ، سانولیوں کے کم، کالیوں کے کمتر، ہر شخص کو حق حاصل ہے، کہ انہیں نظر کی ترازو میں تول لے، بستر کی قیمت پوچھے اس میں کمی چاہے، جی نہ مانے تو

کہیں اور معاملہ کرلے،

اسی بازار میں، خورشید نام کی ایک لڑکی اکہرے مکان کے چوبارے پر بیٹھتی ہے، اُس کی ایک ہم نشین زمرّد ہے، دونوں کی عمر میں تھوڑا ہی فرق ہے، خورشید کا رنگ ملیح ہے، آنکھیں گول، پلکیں لانبی، قد میانہ، ناک نقشہ تیکھا، لہجہ کی اصل پنجابی ہے، لیکن، زبان میں دہلی کا پیوند بھی لگا ہے، عموماً لٹھے کی شلوار اور پھولدار قمیص پہنتی ہے، کانوں میں سونے کی بالیاں جھلمل جھلمل کرتی ہیں، نظر بہ ظاہر کسی اچھے گھرانے کی "آبرو" معلوم ہوتی ہے لیکن زمانے کی ٹھوکر سے بے راہ ہوگئی ہے، خورشید اور زمرّد، دونوں ہمارے پاس آ بیٹھیں، خورشید نے چھٹتے ہی سوال کیا، "کہئے کیا حکم ہے"

"ہم سات ہیں اور ٹھیرنا چاہتے ہیں"۔

"ہم دونوں کے پاس"

"صرف تمہارے پاس"

"فی جوان پانچ روپیہ" اُس نے سگریٹ کا بھرپور کش کھینچتے ہوئے کہا "لائیے پینتیس روپے اور باری باری آئیے،

پینتیس روپے بہت زیادہ ہیں، فی جوان تین روپے۔

"اونہہ" اُس نے زینہ کا راستہ بتاتے ہوئے کہا، آپ جا سکتے ہیں۔ تین روپے میں تو مرغی بھی نہیں ملتی ہے،

ہم نے تکلفاً مڑنا چاہا لیکن اُس نے روک لیا۔

"چار روپے سہی"

جی نہیں تین روپے،

اُس نے ایک سرد آہ کھینچی، اور کہا۔

"اچھا تو نکالیے اکیس روپے"

ہم سب ٹھٹھر گئے اختر اور قاضی میرے منہ کو دیکھنے لگے، قاضی کے رخساروں پر لٹکتا ہوا گوشت اور بھی لٹک گیا۔ اُس نے عینک کے دبیز شیشوں پر کمخواب کی پٹی پھیرتے ہوئے دبے الفاظ میں کہا۔

"۲۱ روپے"

وہ تاڑ گئی کہ خالی خولی جنٹلمین ہیں۔ اُس کے ہونٹ ایک غلیظ سا فقرہ لڑھکانے کے لئے مضطرب ہی تھے کہ اختر نے جیب سے دو سُرخے نکالے اور کہا یہ لو بیس روپے، ہم کچھ معلومات لینے آتے ہیں۔

"معلومات"

"جی ہاں"

"کیسی"

یہی آپ کے پیشے کے متعلق ؟

تو آپ صبح تشریف لائیے۔ اُس نے دس دس کے دو نوٹ مٹھی میں،

بھینچتے ہوئے کہا آپ چاہیں تو یہ نوٹ واپس بھی لے سکتے ہیں۔

"نہیں! دن میں آنا مناسب نہیں۔ اس وقت ہر خصوصیت معلوم ہو سکتی ہے"

اُس نے ماتھے پر دو چار شکنیں ڈالیں، پھر کچھ سوچا، اور کہا۔

اچھا تو پوچھئے آپ کیا چاہتے ہیں"۔

"تمہارا نام"

"خورشید"

"گھر کہاں ہے"

"جہاں آپ دیکھ رہے ہیں"

"ہمارا مطلب ماں باپ کے گھر سے ہے"

یہ نہ پوچھئے، اس بازار کی کوئی عورت بھی اپنا صحیح پتہ بتانے کو تیار نہ ہو گی، یہ سب جسیم ہیں یا گالی! جو عورتیں جھوٹ موٹ اپنا نام یا پتہ بتاتی ہیں وہ فریب دیتی ہیں،

ایک اور سوال کے جواب میں اُس نے کہا

غور سے دیکھئے یہ سب مکان نہیں دڑبے ہیں، ایک چھوٹے سے حجم کے دڑبہ کا کرایہ بھی سو، سوا سو سے کیا کم ہے، شہر میں ایسا مکان پانچ یا چھ روپے ماہانہ پر مل جاتا ہے، لیکن اس لنکا میں ہر کوئی باون گز کا ہے، مالک کا منشی

ہر روز کرایہ ہوتا ہے، تمام گلی کے مکان تین یا چار اشخاص کی ملکیت ہیں، اُن کی آمدنی ہزار ہا روپیہ ماہوار ہے، جو عورت روزانہ کرایہ نہ دے سکے اُس کا سامان بلا توقف باہر پھینک دیا جاتا ہے، کئی لوگ پگڑی دینے کو تیار رہتے ہیں، چونکہ آجکل کساد بازاری ہے اس لئے، بعض دڑبوں میں دو دو چار چار بیٹھتی اور گزارہ کرتی ہیں، البتہ جو ٹھیکیداروں کے قبضہ میں ہیں اُن کا معاملہ صاف ہے۔ جب تک ان کے جسم کی مانگ رہتی ہے وہ ٹھیکیداروں کی دولت میں تواتر سے اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں، جسم ڈھلا نہیں اور ٹھیکیداروں نے نکالا نہیں، وہ دیکھیے، سامنے ایک ڈھلے ہوئے جسم کی عورت لوہے کی کرسی پر بیٹھی ہے، اس نے اپنے مالک کے قحبہ خانے کی بنیاد رکھی ہے، جوانی بھر اُس کو کما کر دیتی رہی ہے۔ اِسی کی کمائی سے اُس نے بعض دوسرے جوان جسم خریدے ہیں، پرسوں اُس نے مالک سے کہا گرمی زیادہ ہے، مجھے بھی ایک پنکھا لے دو اُس نے گالی لڑھکاتے ہوئے کہا یہ مُنہ اور مسور کی دال، تین روپے روز اڈے کا کرایہ آٹھ آنے کی بجلی آٹھ آنے پنکھے کا کرایہ، ڈیڑھ روپے روز کی روٹی، اور پھر کپڑا لتا، اب کمائی کیا ہو کبھی چار اور کبھی پانچ، اُس نے اصرار کیا تو اُس بُری طرح پیٹا کہ پناہ بخدا وہ چاہتا ہے، یہ چلی جائے تو اس کی جگہ ایک جوان جسم لے سکتا ہے، تو یہ چلی کیوں نہیں جاتی؟

کہاں جائیے ؟ اب ہڈیوں کا خول ہی تو ہے ؟ آپ نہیں جانتے ایک
کسبی کا بڑھاپا بڑا ہی ویران ہوتا ہے۔

وہ دیکھئے اس طرف، ایک معمر عورت مونڈھے پر بیٹھی ہے۔ اس
کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں، اب بچارہ ناچار "آزاد" ہے۔ بڑی مشکل
سے، دو چار روپیہ پیدا کرتی ہو گی۔ اس نے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں خرید
رکھی ہیں انہیں بھائی کی بیٹیاں ظاہر کرتی ہے، خود گور کنارے آ گئی ہے
لیکن ان کی جوانی کے خیال سے مطمئن ہے،

"آخر یہ سب لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں ؟"

اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پھر بات اٹھاتے ہوئے کہا،

اس گلی میں اس وقت کوئی چار سو کے لگ بھگ لڑکیاں ہیں، آتی
کہاں سے ہیں ؟ سنیئے ؟

کوئی دو ڈھائی سو تو چند پٹھان ٹھیکیداروں کی ملکیت ہیں، اکثر سرحد
کے مضافات سے خرید کی گئی ہیں۔ بعض کو ان کے والدین روپیہ لے کر
بیاہ دیتے ہیں اور پھر انہیں مصنوعی "خاوند" یہاں لا بٹھاتے ہیں، کئی بردہ فروشوں
سے خریدی جاتی ہیں، ان بردہ فروشوں کی کڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں،
جب کوئی عورت ایک چکلہ میں خاصی ہتھے چڑھ جاتی ہے، تو پھر اس کو دوسرے
شہر کے لئے بیچ دیا جاتا ہے، جو عورتیں اپنے طور پر بیٹھی ہیں، ان کی حیثیتیں

مختلف ہیں، مثلاً بعض یتیم خانوں سے اغوا کی گئی ہیں، بعض کے والدین بیچ جاتے ہیں، بعض سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آکر بھاگ آتی ہیں، بعض کو جنسی لذت لے آتی ہے، بعض کے آشنا دغا دے جاتے ہیں، بعض کا مسئلہ صرف پیٹ کا ہے اور اب بیسیوں "مہاجرہ" ہیں۔

"کیا انہیں اس زندگی سے گھن نہیں آتی؟"

"ضرور آتی ہے لیکن مجبور ہیں۔"

"کیا مجبوری ہے؟"

اس نے پھر زناٹے کا ایک قہقہہ لگایا اور زمرد سے کہا، سمندر کو آواز دو، دو چلینگ چائے لے آئے ——!!

مجبوری تو ظاہر ہے جو مالکوں کی قید میں ہیں، وہ بے بس ہیں، انہیں معلوم ہے کہ ان کے متمول مالکوں کا کچھ نہیں بگڑ سکتا، وہ انہیں مجازی خدا سمجھتی ہیں۔

عورت اور روپیہ طاقت و رسفارش ہیں، ان کے سامنے قانون اور انصاف بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، ان میں سے بعضوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ چکلے کے باہر کوئی اور دنیا بھی ہے، یہ گاؤں کی لڑکیاں، لاہور کو بھی گاؤں ہی سمجھتی ہیں، ان کے نزدیک، ساری دنیا ایک چکلہ ہے، اور یہ اس چکلے کی ایک فرد —— اور پھر ایک کسبی کی فریاد کون سنتا ہے دنیا مردوں

کی ہے اور ان کے مالک مرد ہیں، دنیا دولت والوں کی ہے، اور اُن کے آقا دولت والے ہیں، فرض کیجئے یہاں سے بھاگ بھی جائیں، لیکن جائیں کہاں؟ کیا کوئی مرد بستر بنائے بغیر عورت کو سہارا دینے کے لئے تیار ہے؟

"اور یہ جو خود بیٹھی ہیں، اُن کی مجبوری کیا ہے"؟

آپ ٹھیک کہتے ہیں بظاہر کوئی مجبوری نہیں یہ جا بھی سکتی ہیں لیکن ان سے احساس نفس جاتا رہا ہے، اب ان کی عادتیں پختہ ہو کر فطرت بن چکی ہیں "اس کے پس منظر میں ایک تو پیٹ کا مسئلہ ہے، دوسرے اُن کی عادتیں اتنی خراب ہو چکی ہوتی ہیں کہ، وہ اس ماحول سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہیں، جب وہ اس ٹھکانہ پر آ بیٹھتی ہیں تو پھر اُن کے لئے کوئی ٹھکانہ باقی نہیں رہتا ہے۔

"کیا انہیں ماں باپ کا خیال آتا ہے"؟

وہ چپ ہو گئی، لیکن زمرد نے چائے کی پیالیاں پیش کرتے ہوئے کہا، آپ کا سوال احمقانہ ہے؟ عورت کا دل بڑا ہی نرم و نازک ہے ہر بیٹی، ماں کی گود کو ضرور یاد کرتی ہے، خورشید کا چہرہ اشکبار ہو رہا تھا، اس نے پلو سے، آنسو پونچھتے ہوئے کہا،

اس سوال کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔

کچھ اور پوچھیے؟

آپ کسی کے عقد میں کیوں نہیں چلی جاتیں؟

"عقد تو روز ہوتا ہے لیکن ہر مرحلہ کے ساتھ ہی طلاق بھی ہو جاتی ہے"

معاف کیجئے مردوں میں شادی کی خواہش بستر تک ہی رہتی ہے، جب خون کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو پھر شادی کا خیال بھی اُڑ جاتا ہے،

"کیا آپ کو لائسنس لینا پڑتا ہے؟"

"جی نہیں تھانے میں رپٹ لکھوا دی جاتی ہے"

"کوئی ٹیکس وغیرہ؟"

"پیشہ کا ٹیکس تو کوئی نہیں، ویسے کئی ٹیکس ہیں"۔

مثلاً

بس یہ مثلاً نہ پوچھئے۔ اس مثلاً میں بڑے خطرے ہیں؟ مثلاً مرد کی بیگار اُس کی محنت ہے، اور عورت کی بیگار اُس کی عصمت ——!

کیا یہ صحیح ہے کہ کارپوریشن کے ڈاکٹر ہر مہینے معائنہ کرتے ہیں۔

"جی ہاں ہر مہینہ تو نہیں، لیکن سہ ماہی ششماہی چلے آتے ہیں"۔

"مشہور ہے کہ، مہلک مردانہ امراض ان گھروں ہی سے تقسیم ہوتے ہیں"۔

ہو سکتا ہے بعض عورتیں مریضہ ہوں، لیکن جو کچھ مرد دے جاتے ہیں وہی لے جاتے ہیں، اس قسم کے مرض عورت کا مرد سے صحیح انتقام ہیں؟

"تمہاری آمدنی کیا ہے"؟

یہ ایک کاروباری راز ہے!

ان عورتوں کی آمدنی کیا ہو گی؟

ہر عورت کی مختلف آمدنی ہوتی ہے، بعض دن میں سو بھی کما لیتی ہیں، بعض پچاس، بعض چالیس، بعض دس پندرہ اور بعض چوبیس گھنٹے میں دو چار سے آگے نہیں بڑھتیں، کئی معمریں دو دو روز کچھ نہیں کماتیں، آجکل ویسے ہی مندا ہے،

اور یہ جو ٹھیکیداروں کے قبضہ میں ہوتی ہیں، انہیں کیا ملتا ہے؟

روٹی، کپڑا،

اس کے علاوہ؟

اس کے علاوہ، دھول دھپا، گالی گلوچ، آپ باور کیجئے ان میں سے اکثر نے یہ پاس کی شاہی مسجد کے مینار تک نہیں دیکھے ہیں، شہر کا تو ذکر ہی کیا ہے،

"تو گویا یہ عورتیں نہیں ہیں"۔

"جی ہاں کھلونے ہیں دلچسپ کھلونے، جن سے کائنات کی ہر شے کھیلتی ہے،

"کیا سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں آپ کوئی چھٹی بھی مناتی ہیں"؟

"عاشورہ کے دس دن"۔

"اور عید، شبرات، وغیرہ"۔

"یہ تو ہماری کمائی کے دن ہوتے ہیں"۔

"رمضان المبارک کے مہینہ میں"؟

"ہمارا کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے، اور روزہ کا تعلق دن سے ہے"

آپ کو عاشورہ سے کیا تعلق ہے؟

حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شہادت کے دن ہیں ہم مذہباً ان دنوں کا احترام کرتی ہیں،

"کیا تمہیں مذہب سے دلچسپی ہے"

کیوں نہیں، ہم بھی بفضلہٖ تعالیٰ مسلمان ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہگار ہیں لیکن خدا کی رحمت کے دروازے تو ہم پر بند نہیں، سب تہتیں پیر فقیر مناتی ہیں نذر نیاز دیتی ہیں مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتی ہیں خانقاہوں کے سلام کو جاتی ہیں عاشورہ کے دنوں میں ماتم کرتی ہیں تعزیہ نکالتی ہیں علم اٹھاتی ہیں۔

میں نے جائزہ لیا تو اُس کا مکان ڈربہ نہیں تھا دو کمرے تھے۔ پہلا کمرہ "انتظاریہ" تھا جہاں وہ کرسی پر بیٹھی گاہکوں کی راہ تکتی ہیں دوسرا کمرہ خلوت خانہ تھا جہاں مرحلے طے ہوتے ہیں، دوسرے کمرے میں ایک چوبی پلنگ

پڑا تھا، اس پر ایک توشک تھی اور توشک پر سفید چادر پلنگ کے دو چوکھٹوں میں دو رنگی تصویریں جڑی ہوئی تھیں اوپر دیوار پر اخباروں کے تصویری تراشے لئی سے چسپاں تھے، ثریا، کامنی، نرگس، نمی، صبیحہ اور نور جہاں، کے فوٹو، فریم کئے ہوئے تھے، ایک کونے میں جستی حمام پڑا تھا، اس کے پہلو میں مٹی کا گھڑا اور مٹی کا لوٹا رکھا تھا غالباً شہتیروں کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے اخباروں کے پرزے چھت میں چپکا دیئے گئے تھے، ——— معنی خیز سرخیاں، دلچسپ عبارتیں ؎

حکومت پاکستان چکلے اٹھا دینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے،

• زمیندار

چٹان کو فحاشی کے الزام میں بند کر کے، حکومت نے مستحسن قدم اٹھایا ہے،

• آفاق

پاکستان کا دستور شرعی بنیادوں پر بنایا جا رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی کی توضیحات،

• احسان

بیڈن روڈ پر ایک نوجوان عطاء الرحمٰن نے خودکشی کر لی، وہ کئی روز سے بھوکا تھا،

• امروز

مجھے عصمت فروشی کے لئے مجبور کیا جاتا رہا ہے، عدالت میں حسن بانو کا بیان،

• نوائے وقت

یہ حکومت غیر اسلامی بنیادوں پر قائم ہے، مولینا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصریحات،

تسنیم

نیلم کی کہانی

"ایک حقیقی الطف نظم میں اتنی دلکشی نہیں ہوتی جتنی دلکشی ایک معمولی عورت میں پائی جاتی ہے"——— (چینی مصنف)

غور سے دیکھا تو نیلم کے چہرے پر ابھی تک عورت کا روپ تھا پہلے اُس کا مکان چیت رام روڈ پر تھا، اب بازار شیخو پوریاں میں ہے ان پانچ سالوں میں اُس پر مصیبت کی ایک پوری کہانی بیت چکی ہے اب وہ ایک خرانٹ عورت ہے، اُس کا مکان، بہت سی نوخیز ردوں کا اڈہ ہے، وہ اُن کی مالکن ہے، وہ اُن کی معلمہ ہے، وہ اُن کی آپا ہے، وہ ایک داستان گو ہے، لیکن خود بھی ایک سرگذشت ہے، اب اُس کا گورا رنگ مدھم ہو چکا ہے اُس کی چپٹی ناک اور بھی بیٹھ گئی ہے، وہ میانہ قامت ہے، لیکن بالا بلند دوش سے شانے ملاتی ہے، اُس کی آنکھوں میں مضمحل سا رس ہے، لیکن ڈورے

نرمئی ہیں اُس کے یاقوتی ہونٹوں پر بہت سی کانٹیں ہیں۔ جن سے اَن گنت تماشائیوں کی شب بسری کا سُراغ ملتا ہے۔ اُس کا لہجہ بے وقار ہونے کے باوجود خنک ہے، اس کی زندگی کئی مخاصمتوں اور مفاہمتوں کا سنگم ہے وہ ان عورتوں کا صحیح نمونہ ہے۔ جن میں افتادِ زمانہ سے کئی عورتوں کی خصوصیتیں جمع ہو جاتی ہیں، حرّافہ کا شُہدپن، ——— رنڈی کا فحش، ——— نائکہ کا تجربہ اور مدخولہ کی سینہ زوری۔

"آپ اس بازار میں کہانیاں جمع کر رہے ہیں؟" اس نے کہا ——— مشغلہ تو اچھا ہے۔ لیکن آپ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جتنی بھی عورتیں اس بازار میں ہیں، سب ایک ہی ٹہنی کی پتیاں ہیں، سب کا درد یکساں ہے۔ سب کی کہانی ایک سی ہے، سب خوش ہیں، سب ناخوش ہیں، سب عورتیں ہیں اور کوئی بھی عورت نہیں ہے۔ بھلا وہ عورت، عورت رہ جاتی ہے جسکی آبرو کے دروازے پر ہر کوئی دستک دے لے، جس کی کوئی رات اپنی نہ ہو اور جس کا بستر کرایہ کی چیز ہو ——— ہاں! آپ میری کہانی پوچھنا چاہتے ہیں، تو سُنئے ——— یہ اس عورت کی کہانی ہے جو سب کچھ ہار چکی ہے

"میرے والد پٹیالے میں اپنے گاؤں کے نمبردار تھے۔ ان کا نام شیخ عطا محمد ہے، وہ تین سو بیگھے بارانی اور تین سو پینسٹھ بیگھے نہری زمین کے مالک تھے، جب بٹوارہ ہو گیا تو ہمیں گاؤں چھوڑنا پڑا۔ ریاست نے مسلمان پناہ گزینوں

کے لئے بہادر گڑھ کیمپ جاری کر رکھا تھا سارا کنبہ وہیں پہنچ گیا۔ ہزارہا لوگ تھے، بٹوارہ کیا تھا، ایک زلزلہ تھا، چاروں طرف خون ہی خون تھا، ہندو صرافوں نے لاکھوں روپے کا سونا تیس روپے تولہ کے حساب سے خرید کیا، مہاراج کے فوجی صبح و شام کیمپ کا چکر لگاتے، جو عورت پسند ہوتی اٹھا کر لے جاتے۔"

اس پر اس کی آواز کسی قدر رُندھ گئی ——— "ٹڈی دل نہیں ٹڈی دل ——— انسانی آبرو کو بُری طرح اُجاڑ رہا تھا۔ ہزارہا مسلمان بے حس دھاتوں کی طرح تھے، باپ اور بھائی کے سامنے، اُن کی بیٹی اور بہن کو ٹٹولا جاتا، حکم ہوتا نقابیں اُلٹ دو، سو رما لڑکیاں چُن لیتے گویا لڑکیاں نہیں جانمیں ہیں۔ کوئی قانون اور انصاف نہ تھا۔ بیس روپے سیر آٹا۔ دو آنے میں پانی کا گلاس اور چالیس روپے سیر نمک ———!

"تم پر کیا بیتی ———؟"

"ہم پر ——— ماں نے تو کیمپ ہی میں دم توڑ دیا والد کی عمر اسی برس کی ہے اور ہمیں اس حالت میں دیکھنے سے پہلے ہی اندھے ہو چکے ہیں ہم کل آٹھ جی ہیں۔ بڑی بہن، چھوٹی بہن، بھتیجی، تین چھوٹے بھائی، اور میں، ان سب کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔"

"تمہارے ———؟"

"جی ہاں ـــــــــ!"

"اور تم یہاں کیسے پہنچیں ـــــــــ؟"

"پاکستان تک تو خدا لایا تھا۔ اِس بازار میں پیٹ لے آیا ہے۔"

"کیا تمہارا سورماؤں کے ہاتھ سے بچ نکلنا معجزہ نہیں؟"

"جی ہاں ـــــــــ وہ تو میں نے عرض کیا نا کہ خدا لے آیا ہے، خان لیاقت علی خاں کی بدولت سپیشل ٹرین کا انتظام ہو گیا اور ہم شاہدرہ پہنچ گئے۔"

"پھر کیا ہوا ـــــــــ؟"

پھر کیا ہوتا۔ کئی روز تک وہاں پڑے رہے۔ اسی اثنا میں ادھیڑ عُمر کے ایک شخص نے دستگیری کی اور خدا ترسی (اِس پر وہ ذرا مسکرائی) کے جذبے میں گھر لے گیا۔ اُس کا مکان انار کلی میں تھا۔ اس نے ہمیں چھینٹ کے کپڑے سلوا دیئے۔ اُس کی میٹھی باتوں میں امرت تھا۔ والد مکان وغیرہ الاٹ کرانے کی فکر میں تھے اور وہ شخص اُن کی درخواستیں لے جاتا، لیکن بےسود ـــــــــ تیسرے چوتھے روز ایک عورت نے آنا شروع کیا، اُس کا نام گلزار تھا، پہلے اکیلی آتی رہی، پھر اُس کے ساتھ کچھ جوان لڑکیاں آنے لگیں۔ تمام ریشمی کپڑوں اور سونے کے زیورات میں لدی پھندی ہوئیں۔ ایک دن اُس نے مجھے بہکانا شروع کیا۔"

"دیکھو تمہارا باپ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے خود بے دست و پا ہو۔ یہ

خواری اچھی نہیں، غیر کب تک روٹی کھلا سکتا ہے ——— گانا سیکھ لو اس میں کوئی برائی بھی نہیں ——— ایک آرٹ ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے روٹی کی صورت قائم ہو سکتی ہے "یہ میرے لئے ایک نیا مرحلہ تھا۔ میرا انگ انگ کانپ گیا۔ کئی خوف میرے سامنے آ گئے۔ خدا کا خوف ——— ضمیر کا خوف ——— انسان کا خوف، باپ کا خوف اور اس ماں کی قبر کا خوف جس کی چھاتی سے ہم نے دودھ پیا تھا۔ گلزار کی چکنی چپڑی باتوں نے میرے دماغ کو ہموار کر دیا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھی اور ہمارا پیٹ خالی تھا۔ سوچا تو دل نہ مانا۔ میں نے انکار کیا۔ اس کا اصرار بڑھا۔ میں نے احتجاج کیا ——— اور وہ مرد جو ہمیں اس مکان میں لے آیا تھا۔ کئی دنوں سے غائب تھا۔

گلزار نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا تو مطالبہ کیا کہ اب تک تم پر آٹھ سو روپیہ خرچ ہو چکا ہے وہ ادا کر دو۔ تو تمہیں چھٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر اس بازار میں پہنچ لئے۔ اگلی صبح استاد جی آ براجے۔ تعلیم شروع ہو گئی۔ آواز میں لوچ تو تھا ہی، اب ترتیب پا گیا، اور ناچنا کچھ تو اس فضا سے سیکھا، کچھ فلموں سے حاصل کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آواز کی آڑ میں جسم کا چرچا ہو گیا۔ آپ یقین کیجئے میں نے ضمیر کی ایک ادنےٰ سی گھبراہٹ کے بعد اپنا جسم بیچ ڈالا

اب ہم دونوں بہنیں بازار کا مال تھیں ——— "

"تمہارا دل اس سے متنفر نہ ہوا ؟"

"کیوں نہیں لیکن یہ ماحول ایسا ہے کہ جب کسی نہ کسی طرح کوئی آدمی یہاں قدم رکھ لیتا ہے، پھر وہ اس کے بغیر ایک کمی سی محسوس کرتا ہے۔"

"کیا پٹیالہ میں تمہارا نکاح ہو چکا تھا ؟"

"جی ہاں ! میری بہن نے خود طلاق حاصل کی اور مجھے طلاق مل گئی تھی۔"

"کیا وجہ ہوئی ؟"

"یہ خاندانی جھگڑے کچھ عجیب سے ہوتے ہیں، ان کے ذکر سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

"اچھا تم نے کچھ راگ بھی سیکھے ہیں ؟"

"صرف ایک راگ جس کا کوئی نام نہیں ہے اور وہ اصلی راگ گانے والیاں تو اس بازار میں دو چار ہی ہیں، ہمارا کام تو صرف خوش وقتی ہے۔

"گلزار نے تمہیں کیا دیا ؟"

"مجھے اور میرے متعلقین کو روٹی کپڑا ——— "

"اور تم نے اس کو کیا دیا ؟"

"میں نے اور غفوران نے دیکھی ایک بے سہارا پناہ گزین لڑکی ہے،
اس کو ایک سال میں چالیس ہزار سے زائد روپیہ کما کر دیا ہے۔ جس سے وہ
ایک عالی شان بلڈنگ خرید چکی ہے۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ اسی بازار میں ہے۔ اس کے پاس کئی لڑکیاں ہیں جب اس کا جبر
بڑھا، تو میں نے ایک آدمی کے مشورے سے علیحدہ کاروبار شروع کیا۔ یہ دو کمرے
ہیں جنکا کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہے۔ خدا کے فضل سے اچھے دن گزر رہے
ہیں۔"

"خدا کا فضل ——————؟"

"کیوں آپ کو اس پر تعجب ہے، خدا کا فضل نہ ہو تو ہمارے لئے
کوئی ٹھکانہ نہیں، ہر کوئی ہمیں خانگی کہہ کر پکارتا اور مویشی سمجھ کر ہنکارتا ہے،
ہماری عزت یا محبت صرف بستر تک ہے۔ اس کے سوا کوئی عزت
نہیں۔"

"تو پھر آپ لوگ یہ پیشہ ترک کر دیں؟"

"ہم تیار ہیں۔ لیکن جائیں کہاں اور قبولے کون؟ لوگ کھیلتے ہیں، بیاہتے
نہیں۔ کئی دفعہ اخباروں نے چکلے اُٹھا دینے کا شور برپا کیا ہے، لیکن ہوتا
ہواتا کچھ نہیں جو اٹھانے والے ہیں۔ وہ راتوں کو چوری چھپے آتے ہیں اور

جو شور مچا رہے ہیں وہ اس لئے کہ انگور کھٹے ہیں، کس کا جی چاہتا ہے کہ شارعِ عام بنے۔ عورت نہ ہوئی اخبار ہو گیا۔"

"لیکن حکومت پر زور تو دیا جا رہا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— "آپ بھی انجان بنتے ہیں، حکومت کے لئے اور تھوڑے کام ہیں؟ یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق عوام سے ہے۔"

"لیکن حکومت کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں، اور وہ اپنے فرائض کو بڑی خوبی سے پورا کرتی ہے۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے ایک دفعہ قلعہ کی سیڑھیوں پر سلامی لی تھی تو ان کے لئے قلعہ کی سیڑھیوں پر جو قالین بچھائے گئے تھے وہ ہمارے مکانوں ہی سے گئے تھے، جب بھی قلعہ کے باہر یا قلعہ کے اندر کوئی سرکاری تقریب ہوتی ہے تو ہمارے مکانوں ہی سے قالین جاتے ہیں۔"

"اوہو؟ یہ تو ایک خبر ہے۔"

"خبر کیسی؟ راعی کا رعایا پر حق ہوتا ہے اور ہمیں تو سرکاری دنگل کے لئے بھی ٹکٹ خریدنے پڑتے ہیں۔"

"آپ لوگ انکار کیوں نہیں کر دیتے۔"

"خوب! آپ بھی دُور کی لے رہے ہیں۔ حضور ہمیں تو بسا اوقات تھانیدار

کے مہمانوں کے لئے بستر بھیجے پڑتے ہیں، ایسا نہ کریں تو ہمارا کاروبار ایک دن بھی نہ چل سکے۔ ہم لوگ عیبوں کی گٹھڑی ہیں، جو شخص بھی یہاں آتا ہے وہ اخلاقی چور ہوتا ہے اور ظاہر ہے پولیس سے جھگڑا مول لے کر بھوکوں مرنے والی بات ہے بلکہ قید ہونے والی"۔

"تم بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں"۔

"مجھ سے اور میرے جسم سے تو بیاہ کرنے والے کئی ہیں۔ نہ بھی ہوں تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن میرے بوڑھے باپ اور ناچار کنبہ کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ ایک دفعہ ایک مقامی بنک کا مینجر مجھے گھر لے گیا، لیکن دوسرے مہینے ہی اُکتا گیا۔ مجھے تو رکھنے کے لئے تیار تھا لیکن گھر والوں کو نہیں! اور اب تو میں بیاہ کے لفظ ہی کو مذاق سمجھتی ہوں"۔

"اچھا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"محبت ——" وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی اور پھر یکایک بولی:۔

"جی نہیں اور بالکل نہیں۔ محبت ایک فضول چیز ہے۔ اس سے معزز خاندانوں کی کنواریوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے، ہمیں نہیں۔ ہم دکاندار ہیں۔ دکاندار کا کام گاہک سے محبت کرنا نہیں۔ جب کوئی شخص ہمیں محبت جتلاتا ہے۔ تو ہم اُسے یا تو پاگل سمجھتی ہیں یا یہ کہ اس کی گرہ میں مال نہیں ہے۔ ہمیں صرف ایک چیز

سے محبت ہے اور وہ ہے روپیہ ـــــــ! اُس نے چاندی کے روپے کو کھنکھناتے ہوئے کہا۔ "اِس روپیہ سے ـــــــ!"

"اور جو لوگ تمہارے مکانوں پر آتے ہیں؟"

"وہ بے وقوف ہوتے ہیں یا اوباش۔ بعض عجیب الخلقت بھی آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے تم میری بن جاؤ۔ میں تمہارے لئے بیوی چھوڑ سکتا ہوں۔ کوئی ہمیں خار دینے کے لئے خواہ مخواہ بیوی کا ذکر لے آتا ہے۔ اصل میں اس قسم کے لوگ گاؤدی ہوتے ہیں جس نے سہروں سے بیاہی ہوئی بیوی کی عزت نہ کی وہ ایک طوائف کی عزت کیسے کر سکتا ہے۔"

"بہرحال یہ کام تو بُرا ہی ہے۔"

"کیوں نہیں لیکن اس کی ذمہ دار عورتیں نہیں مرد ہیں۔"

"اِس کا کوئی حل ہے؟"

"ضرور ہے۔ اس بازار میں کوئی تین ساڑھے تین ہزار عورتیں ہیں۔ میرا بس ہو تو بڑے بڑے کنجوں کی دولت ضبط کر لوں اور جتنی اس پیشہ کی عورتیں ہیں۔ ان میں برابر برابر بانٹ دوں۔ دولت اتنی ہے کہ عمر بھر کے لئے سب کی کفالت کر سکتی ہے۔ ان میں سے اسی فی صد کا نکاح ہو سکتا ہے۔۔ جو معذور ہیں۔ ان کیلئے کنجوں کی دولت ہی سے ریسکیو ہوم RESCUE HOME کھولے جا سکتے ہیں۔

"کیا اس کے لئے سب تیار ہونگی؟"

"کیوں نہیں! حرام کی چکنی روٹی سے آرام کی سوکھی روٹی کہیں بہتر ہے۔"

"کیا اس طرح فحاشی رُک سکتی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ فحاشی رُک سکتی ہے یا نہیں؛ البتہ چکلہ ضرور ختم ہو سکتا ہے۔"

وہ ہمیں بیٹھک سے اٹھا کر خلوت خانے میں لے گئی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا لیکن قرینہ سے سجا تھا۔ ایک طرف صوفہ سٹ پڑا تھا۔ ایک تپائی پر ریڈیو تھا دوسری طرف نواری پلنگ بچھا تھا۔ اُس کے اُوپر کی دیوار پر دو بڑے چوکھٹے لٹک رہے تھے۔ جن میں ایک ساتھ بہت سی تصویریں مڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے نیچے بوڑھے اخبار زمیندار کا ایک دلچسپ تصویری تراشہ تھا۔

"خان لیاقت علی خاں پاک پارلیمنٹ میں قرارداد مقاصد پیش کر رہے ہیں"

اس نے کھڑکی کھول دی۔ ہمیں صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود پلنگ پہ دراز ہو گئی۔ سامنے ایک اور قطعہ لٹک رہا تھا۔ ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا ۔۔۔ پر تُو نے دِل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر ۔۔۔ لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا

اس نے زاویہ قائمہ کے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے کہا "مجھے شادی

کرنے میں اب بھی کوئی عذر نہیں لیکن میں شوہر چاہتی ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے اِس بات کا یقین دلا دے کہ وہ عُمر بھر مجھے یہ طعنہ نہ دے گا کہ اُس بازار سے آئی ہو تو میں موٹا جھوٹا پہن کر اور رُوکھی سُوکھی کھا کر بھی گزارا کر سکتی ہوں۔ آپ زندگی بھر میری آواز نہ سُنیں گے۔ لیکن مجھ میں ماضی کا طعنہ سننے کی ہمت نہیں۔ جو عورتیں یہاں سے اُٹھ کر مردوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں وہ غلط امید پر جاتی ہیں۔ انہیں گرہستن کہلانے کا واقعی شوق ہوتا ہے لیکن جب وہ محسوس کرتی ہیں کہ اب بھی اُن کے وجود پر گالی چڑھی ہوئی ہے تو اُن کی عورت پھر مر جاتی اور طوائف جاگ اُٹھتی ہے اور وہ دوبارہ چلی آتی ہیں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ "اب یہاں خاندانی کنچنوں کے مکان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لے دے کر دس بیس گھر ہونگے۔ یہ جو آپ بھرا بازار دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب نوساختہ کنچنیوں کا ہے جنہیں بعض دوسرے اسباب یہاں کھینچ لائے ہیں۔"

"وہ اسباب کیا ہیں؟"

"یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ کچھ دن اس بازار میں پھریئے۔ آپ سب کچھ معلوم کر لیں گے۔ مجھ سے نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔" لیکن ہمارے اصرار پر اُس نے بتایا:-

"اس بازار کی آمدنی کے بڑے بڑے اڈے کوٹھی خانے ہیں۔ ان کوٹھی خانوں

ہیں سب کچھ ہوتا ہے مثلاً جسم بکتے ہیں، شراب بکتی ہے، افیون بکتی ہے۔
اور جوا ہوتا ہے ——"

"تو کیا یہ قانوناً جرم نہیں؟"

"ہے اور ضرور ہے، لیکن قانون عورت اور روپیہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔
ویسے تو کوٹھی خانے قائم کرنا ہی خلافِ قانون ہے۔ لیکن ان پر پردہ ڈالنے
کے لئے ساز رکھے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کوٹھی خانے تو کئی ہیں لیکن
بڑے چار ہیں:—

۱ . . . . . . کا کوٹھی خانہ :— یہ سیالکوٹی چودھری سب سے بڑے
کوٹھی خانے کا مالک ہے۔ اس کے پاس دنیوی وجاہت کی ہر شے موجود ہے
تقریباً ایک درجن لڑکیاں ہیں سب شکل و صورت میں ایک دوسرے سے بڑھ
چڑھ کر ہیں۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ جب تک وہ پانچ لاکھ روپیہ پیدا نہیں کر لیتا
اس پیشہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا ذاتی خرچ سوسوا سو روپیہ
روز کا ہے۔ ہر وقت شراب میں دُھت رہتا ہے۔ اُس کی نائکہ بیوی جس
کی شکل ڈراؤنی ہوتی جارہی ہے، اپنے فن میں بڑی ماہر ہے۔ اس کا کام
صرف گاہکوں کو لُوٹنا ہے، جو اجنبی ایک دفعہ پھنس جائے وہ دوبارہ نہیں
آتا، مگر آدمی آدمی کو پہچانتی ہے۔ ایک نئے پنچھی کے پَر کترنے میں اسے
کمال حاصل ہے۔"

"یہ لڑکیاں کہاں سے آئی ہیں؟"

"کچھ تو باہر سے خریدی گئی ہیں بعض سے چودھری "صاحب نے" نکاح پڑھایا ہے -- یہ شخص اپنے حواریوں کی ایک جمعیت لیکر کسی گاؤں میں چلا جاتا ہے وہاں اپنی رئیسی کا رعب جماتا ہے اور پھر ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق کوئی نہ کوئی عورت بیاہ لاتا ہے، خود نامرد ہے۔ اس کے پاس جتنی لڑکیاں ہیں، سب اس کے دھوکے کا شکار ہیں۔ وہ ان سے دولت پیدا کرتا، دوستوں کو نذر گزرانتا اور عیاش افسروں کو چڑھاوا چڑھاتا ہے۔ بارہا رائفل کے بے جا استعمال میں پکڑا گیا۔ لیکن ہمیشہ چھوٹ گیا۔ اس کی رائفل بھی ضبط نہیں ہوتی ہے یہ اپنی لڑکیوں کو رات کے لئے باہر نہیں بھیجتا صرف "بڑوں" کی کوٹھیوں میں ہی بھیجتا ہے جس کا نرخ بھی گراں ہے۔ ایک شب کی قیمت سو سے اتنی تک؛ ایک مرحلہ کے بیس روپے، دو روپے بستر کا کرایہ، دو روپے دلال کے اور خلوت خانے میں جو کچھ لڑکی چھین لے وہ اس پر مستزاد ہے۔"

"کیا ان لڑکیوں کا جی نہیں اکتاتا ——؟"

"سچ تو یہ ہے" اس نے کہا "اس کے پاس جتنی بھی لڑکیاں ہیں، ان کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ وہ ایک سنگدل قصائی کے قبضہ میں ہیں وہ قرونِ وسطیٰ کے قید خانوں کی زندگیاں گزار رہی ہیں۔ جس طرح گرہستنوں کا کام محض بچے پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کا کام محض دولت پیدا کرنا ہے اور وہ بھی چودھری اور

اور اس کی نائکہ کے لئے ـــــــ ان کے لئے کچھ ہے تو روٹی یا کپڑا انہیں کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں ہے"!

میں نے انہیں کبھی کبھار کوٹھے سے دیکھا ہے۔ اُن کی زندگی ایک پھوڑا ہے ـــــــ لاہور ناسور۔

ایک دفعہ ایک لڑکی نے بھاگنا چاہا، لیکن پکڑی گئی۔ اُس سے جو سلوک کیا گیا وہ اتنا ظالمانہ تھا کہ رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ پہلے اُس کو کئی دن تک گھنٹہ دو گھنٹہ روز لٹکائے رکھا ـــــــ مرچوں کی دھونی دی گئی، ـــــــ آخر اُس کو کئی مردوں کے حوالے کیا اور خود حُقّہ کی نَے منہ میں لئے تماشا دیکھتا رہا۔"

"کیا اس کو خدا کا خوف نہیں ہے"؟

اس نے ایک استہزائی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ بھی عجیب لوگ ہیں، ـــــــ خدا کے خوف کا اس بازار سے کیا تعلق؟ ہمیشہ قصرِ شہی اور قصرِ عیش خدا کے خوف سے خالی رہے ہیں۔ خدا ہوتا ـــــــ" وہ جذباتی ہو گئی۔ "تو اس سامنے کی بڑی مسجد کے مینار صدیوں سے ساکت رہتے؟ اور راوی کا پانی منٹو پارک تک آکر لوٹ جاتا؟"

(۲) . . . . . دوسرا بڑا کوٹھی خانہ ہے۔ اس کا مالک مغویہ عورتوں

کی کمائی کھاتا ہے۔ خود جواری ڈھنڈاری ہے۔ وہ لڑکیاں جو گھر سے بھاگ آتی اور ان کے آشنا دغا دے جاتے ہیں، اس کے کارندے انہیں پھنسا لاتے اور پھر آہستہ آہستہ پیشہ کمانے پر لگا دیتے ہیں۔ اس پر کئی مقدمے بھی چل چکے ہیں لیکن ہمیشہ بری ہو جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں حسن بانو نام کی ایک لڑکی نے اس کے خلاف عدالت میں ایک دردناک بیان دیا تھا۔ خود قانون کی نوک پلک جانتا ہے۔ اس لئے ضابطہ کے اندر رہ کر کاروبار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ شہر کے خوفناک غنڈے ہیں۔ اس کا دعوےٰ ہے کہ وہ ایک رات بھی حالات میں نہیں رہ سکتا۔

(۴۳) . . . . . . کا کوٹھی خانہ ہے۔ خیر سے حافظ جی ہیں۔ بظاہر محلہ شیخوپوریاں میں واشنگ فیکٹری کھول رکھی ہے لیکن ایک حرافہ جو دل سے اس کے ساتھ نہیں اس کے قبضہ میں ہے۔ یہ اس سے نصف کی پتی لیتا اور چوری چھپے الکحل بیچتا ہے۔ جب سے حکومت نے شراب بند کی ہے یہ اور ایسے کئی لوگ سپرٹ میں کیمیاوی اجزا ملا کر شراب کے نام پر فروخت کر رہے ہیں، جس سے اکثر موتیں واقع ہو چکی ہیں۔

(۴۴) . . . . . . کا کوٹھی خانہ ہے۔ یہ واحد عورت ہے جس نے اس بڑے پیمانہ پر اپنا کاروبار چلا رکھا ہے۔ لیکن اس کی آمدنی کئی قسم کے لوگ کھا جاتے ہیں۔ اس کے ہاں مستقل لڑکیوں کے علاوہ باہر سے کچھ لڑکیاں آتی ہیں؛

یہ واقعہ ہے کہ کئی لڑکیوں کے والدین انہیں رات بھر کے لئے چھوڑ جاتے ہیں اور وہ دن چڑھے کمائی لیکر واپس چلی جاتی ہیں۔ کچھ از خود چلی آتی ہیں۔ ایک لڑکی جو کچھ کماتی ہے اس کا نصف مالکن لیتی ہے۔ کچھ مکان کے کرایہ میں وضع ہو جاتا ہے کچھ دلال لے جاتے ہیں اور لڑکی کے حصہ میں ایک تہائی آتا ہے۔

"ایسی لڑکیوں میں سے کسی کا پتہ معلوم ہے؟"

"کیوں نہیں ———— لیکن ماں باپ کے راز کو افشا کرنا ہمارے ہاں کا رواج نہیں ہے۔"

ان کے علاوہ جو چھوٹے چھوٹے کوٹھی خانے ہیں وہ حکومت اضافہ سے انہی لائنوں پر چل رہے ہیں۔ ایک بڑی مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ اب پڑھی لکھی لڑکیاں بھی شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ ادھر ایک لڑکی صغریٰ رہتی ہے جو فر فر انگریزی بولتی ہے، لیکن ماں باپ کی غلطی سے یہاں آ بیٹھی ہے۔ اس نے کالج میں کسی نوجوان سے دوستی پیدا کی۔ اور اس کے ساتھ نکل گئی لیکن وہ ذلیل انسان ہفتہ عشرہ ہی میں غائب ہو گیا۔ صغریٰ نے ماں باپ کی طرف لوٹنا چاہا لیکن عزت آڑے آ گئی۔ اور اب بقول خود والدین کے شہر ہی میں والدین کی غیرت سے انتقام لے رہی ہے۔ وہ کہا کرتی ہے "میرا وجود ایک دعوت ہے، ان لوگوں کے لئے جو ہمیں کھلونا سمجھتے اور اپنی خواتین کو صدف کا موتی کہتے ہیں۔ میرا ماضی ایک

احتجاج ہے اُس معاشرت کے خلاف ــــــ جو محض معاج ہی رواج ہے، میرا حال ایک طنز ہے اُن باپوں کے خلاف ــــــ جن کی بیٹیاں چوری چھپے معاشقے کرتی ہیں ــــــ میرا مستقبل ایک قبر ہے اور اس پہ ایک ہی کتبہ ٹھیک بیٹھ سکتا ہے۔ ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میں نے سوال کیا۔" اگر تمہیں اس ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے تو تم کیا کرو؟"

وہ مسکرائی اور کہا۔" میں سب سے پہلے تمام نشے بند کر ڈالوں ــــــ شراب ــــــ چرس ــــــ بھنگ ــــــ افیون ــــــ چانڈو ــــــ!"

کیوں ــــــ؟

" اس لئے نہیں کہ شرعاً حرام ہیں، صرف اس لئے کہ ان کے استعمال سے جوان، جوان نہیں رہتا۔"

ہم بے اختیار ہنسے، اُس نے کہا۔" آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایک قوم کی عزت اس کے جوان ہوتے ہیں، ہمارے مکان معطل ہیں، میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ سو میں سے ستر نوجوان چہرے سے جوان ہیں لیکن ان کی روحیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔"

ماضی - حال - مستقبل

سخنہائے گفتنی   رفت گذشت   زیرِ تصنیف

ایسی بلندی —
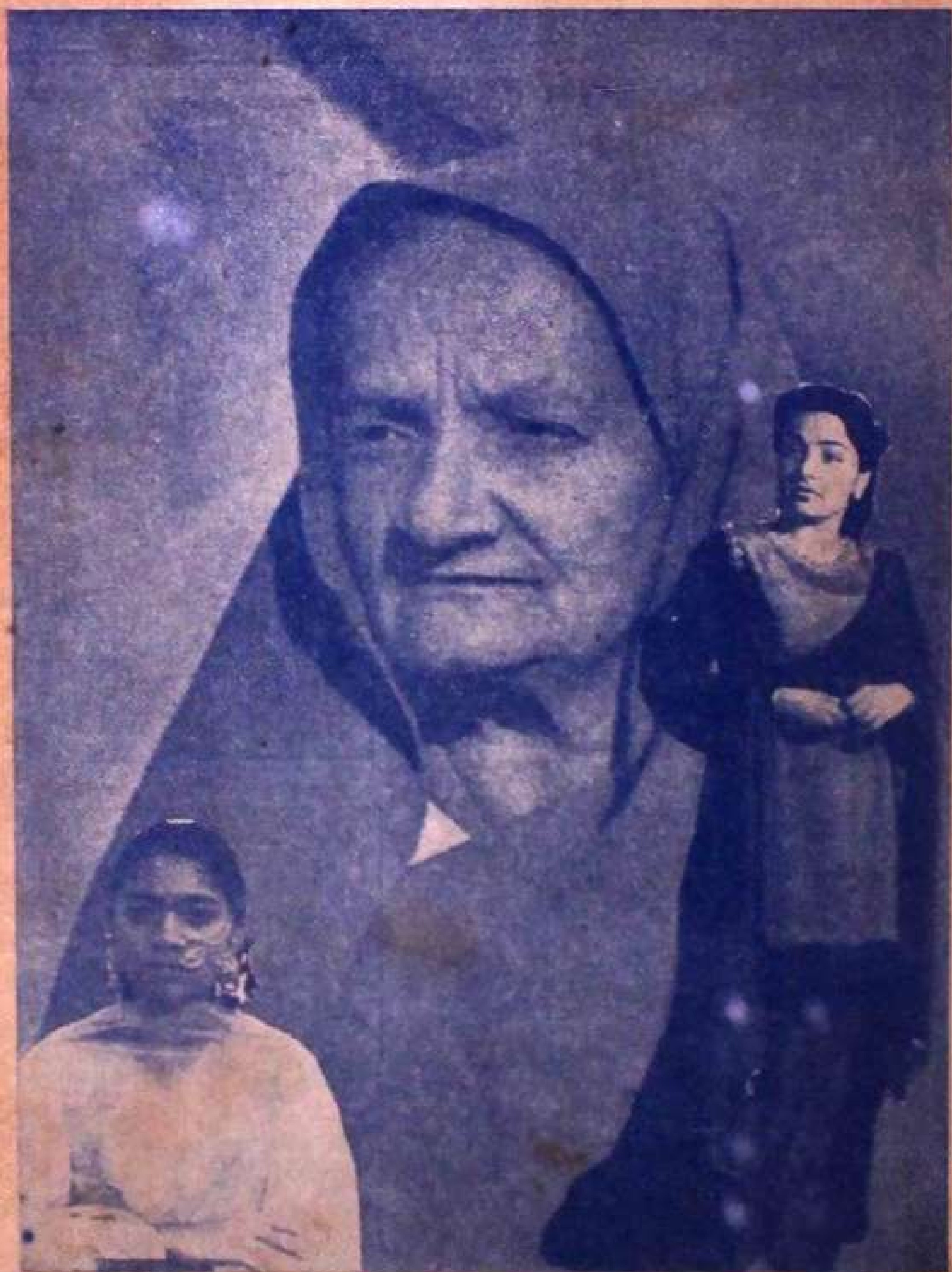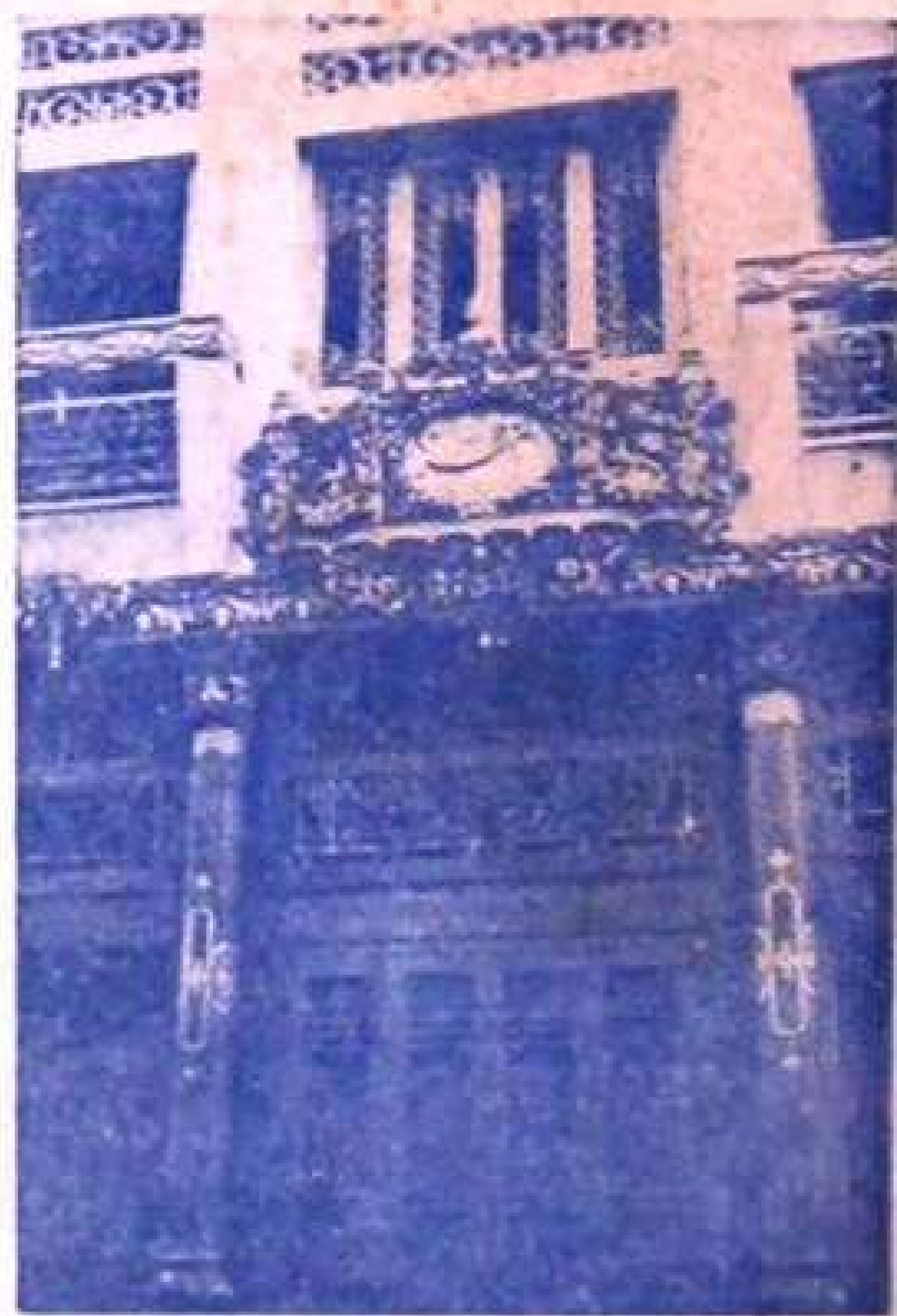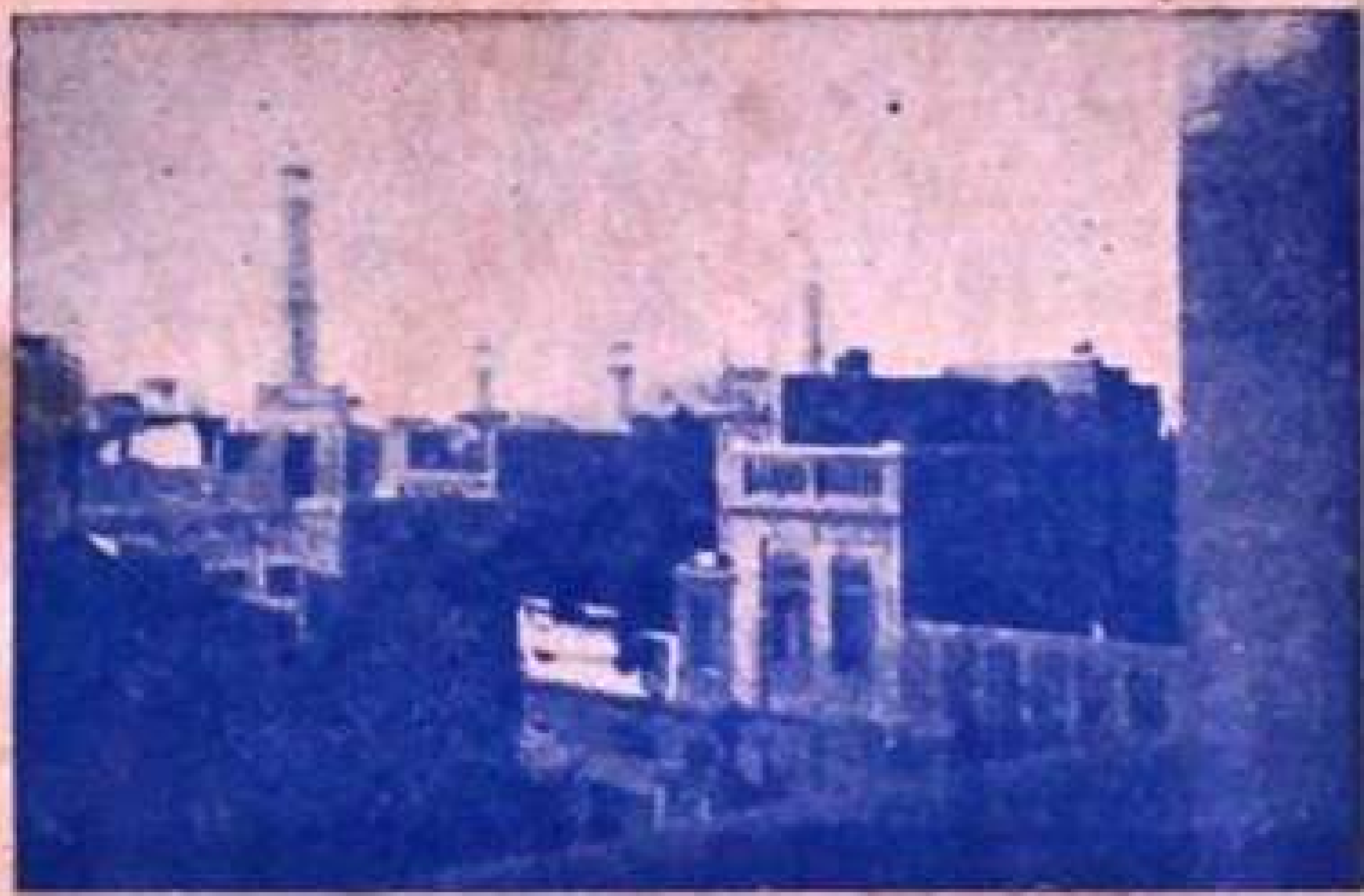
جہاں
راتیں
جاگتی
ہیں

ایسی بستی

اور
دن
سوتے
ہیں

دو بہنیں —— شمشاد اور شہناز

نیلم کی کہانی —

ممتاز کی زبانی ——
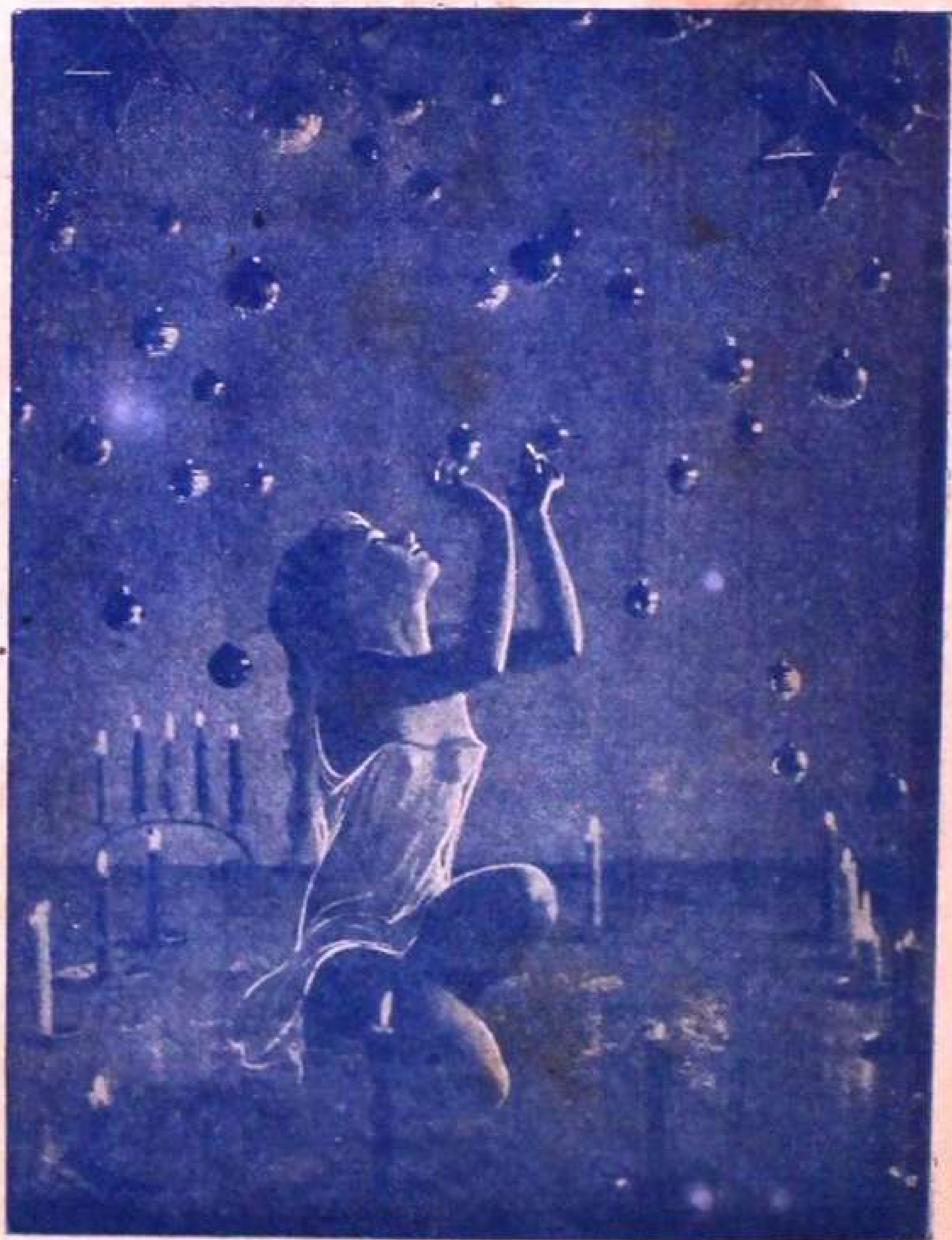
سحر ہونے تک ———

مختار ——

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ناگفتہ بہ

ادھوری راتیں

رُوما

فارس

ٹرکی

پنجابن

راوی کی ایک لہر

کشمیرن

ایک مدھر گیت

پُوربن

چتا کا رُوپ

بنگالن

گیتا نجلی کا صفحہ

پہاڑن

چنار کی چھاؤں

برمن

ناطقہ سر بگریباں

چینی

احتجاج

جاپانی

انتقام

ترکی

حیا کی بھول

مصری

اہرام مصر کا کتبہ

روما

نظم معریٰ

بلغاریہ

بغیر عنوان

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مُمتاز کی زبانی

کاش دنیا میں کسی شے کا کوئی نام نہ ہوتا ——!

(رشل)

شمشاد، امتیاز، ممتاز، اور شہناز چار بہنیں ہیں، ان کا والد امرتسر میں برادری کا چودھری تھا، لاہور میں ان کی دو چچیری بہنیں ہیں، زہرہ اور مشتری آغا حشر والی مختار ان کی خلیری بہن ہے، ملک کی تقسیم سے پہلے، چاروں امرتسر میں رہتی تھیں، اور وہاں ان کا بڑا نام اور کام تھا، اب پانچ برس سے لاہور میں رہ رہی ہیں، بڑی ملنسار ہیں، ان کا وجود ایک ڈیرہ دار طوائف کے خصائص کا صحیح مظہر ہے، ان سے ملنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ وہ طوائف، جس کی سرپرستی، بادشاہتیں، اور پھر ریاستیں کرتی رہی ہیں، اُس کی خصوصیتیں کیا ہوتی

تھیں،

شمشاد اپنے دن بتا چکی ہے اور اب اُس کی جوانی کا دمِ واپسیں ہے
وہ ایک سرو قامت عورت ہے، رنگ سفید ہے، اکہرے بدن کی ہے
لیکن کہا جاتا ہے جب اس کے عروج کا زمانہ تھا، تو بڑے بڑے مہاراج
ادھیراج اس کے مکان کا طواف کیا کرتے تھے، وہ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں
"خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" کے محل میں گا چکی ہے، شہزادہ معظم جاہ، اس کو مجرے کے
لئے بلاتا رہا، اس نے لاکھوں روپیہ کھرے کئے ہیں، بایں ہمہ کہ ان پڑھ
ہے، لیکن اس کی بات چیت، لب و لہجہ، چال چلن، اور نشست و برخاست
اس قدر نستعلیق ہے کہ بعض دوسرے گھر اس خصوصیت میں، بالکل تہی دست
ہیں، اس کی شعلہ صفت آواز میں اب بھی ایک ٹھہراؤ ہے، لیکن جوانی میں
بڑے بڑے مغنی لوہا مانتے تھے، وہ طوائف نہ ہوتی تو بہترین بیوی ہوتی، چونکہ
وہ طوائف ہے، اس لئے مناکحت پر یقین نہیں رکھتی اس نے زندگی بھر
دیوانے پیدا کئے ہیں، لیکن خود کبھی دیوانہ نہیں ہوئی، وہ عشق کو غالبؔ کی
ہمنوائی میں دماغ کا خلل سمجھتی ہے اس کی مجلس میں آج بھی بڑے بڑے
وارفتگانِ شوق بیٹھتے ہیں، ادیب آتے ہیں، وزیر آتے ہیں صحافی آتے
ہیں، خطیب آتے ہیں، جج آتے ہیں، لیڈر آتے ہیں، چونکہ امرتسر کی کئی سیاسی
تحریکوں کا بڑا حصہ اس کی نظروں کے سامنے گذرا ہے اس لئے وہ

بعض اہم سیاسی معرکوں پر بھی گفتگو کر لیتی ہے،

امتیاز، اور ممتاز جڑواں بہنیں ہیں، امتیاز، ان سب میں جسم کے اعتبار سے گاہکوں کا مرکز رہی ہے، لیکن اب وہ، اس پیشے ہی سے متنفر ہے، اس کا دل محبت کی ٹھوکر کھا چکا ہے، وہ کہا کرتی ہے، جس شخص نے اس پیشہ کو ایجاد کیا تھا وہ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرا، زبان سے گونگا، اور دماغ سے محروم تھا، اس کی زبان میں مٹھاس ہے، وہ ایک ہوشیار سیاست داں کی طرح گمبھیر ہے، اپنے دل کا راز کسی سے نہیں کہتی، لیکن کسی کو دھوکا دینا بھی، اس کی فطرت سے باہر ہے، اب اس کا رنگ روپ، ڈھل رہا ہے، اور بدن بھی فربہ ہو چکا ہے لیکن پھر بھی محبت کی چیز ہے اس کی سب بہنیں اس سے محبت کرتی ہیں اور وہ سب بہنوں کی، منشا کے خلاف کسی اور سے محبت کرتی ہے،

ممتاز چھوٹی موٹی ہے، اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے، وہ طوائف ہونے کے باوجود مردسے نفرت کرتی ہے اس کا محبوب مشغلہ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں لطائف گھڑنا ہے، وہ رات کا دیپک ہے، لیکن دن میں اس کا چہرہ ایک سپنا سا محسوس ہوتا ہے، اس کی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے ہوا میں گرہ لگانا اور پانی پر لکیر کھینچنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے، اس لئے اپنے پیشے سے باہر کے واقعات

کبھی جانچ تول لیتی ہے، بلا کی ذہین ہے، بذلہ سنج ہے، طنّاز ہے، موقع محل سے شعر پڑھ لیتی ہے، فقرہ باز ہے، اُس کو الفاظ مسخ کرنے، اور ذومعنی جملے کہنے میں کمال حاصل ہے، گاتی بھی خوب ہے، لیکن ناچتی نہیں، اُس کا خیال ہے ناچنا ہر عورت کے بس کی چیز نہیں اور وہ بے بس ہے، اُس کی رائے میں؛ عورت محبت کرنے کی چیز ہے، سمجھنے کی نہیں، اور مرد سمجھنے کی چیز ہے محبت کرنے کی نہیں، لہٰذا وہ کسی مرد کو بھی محبت کے قابل نہیں سمجھتی، اُس کا لہجہ؛ خواندہ ہونے کے باوجود کبھی کبھار کرخت ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ چٹکی لیتی ہے، تو ایک دفعہ، رو نی سے رو نی صورت بھی مُسکرا اٹھتی ہے،

شہناز تینوں بہنوں سے چھوٹی ہے، اُس میں ایک جوانی ہے، ایک روپ ہے، ایک حسن ہے، ایک نغمہ ہے، وہ اب خاندان کے لئے ایک ہنڈی ہے، اُس کی صورت کو دیکھتے ہی جو خیال معاً پیدا ہوتا ہے، وہ آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ "عورتوں کے سامنے کوئی فلسفۂ حیات نہیں وہ جذبات پر جیتی اور جذبات کے لئے جیتی ہیں وہ سوسن کا پھول ہے، وہ ایک مہک ہے، جو دنیا کی چخ چخ سے پیدا ہوتی ہے، وہ انسان کے ذہن کو پرستش کی بجائے پرستش کی طرف لے جاتی ہے، وہ عام انسانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے؛ ایک احتساب ہے، ایک سوچ ہے، ایک سوال ہے، وہ ایک تختۂ چمن ہے؛ اس کے پیکرِ بدن میں قصائدِ قاآنی کی تمکنت ہے اُس کی طبیعت میں، نظیری

کا شگفتہ پن ہے، اس کی اداؤں میں نہ تو مذاق کے تغزل کا بوجھ ہے اور نہ اس کی ذہانت میں غالب کے تخیل کا عمق ہے، اُس کا سراپا داغ کے بامحاورہ کلام کی طرح نستعلیق ہے، ـــــــ وہ گاتی ہے ـــــــ وہ ناچتی ہے، اُس کی آواز میں رکھ رکھاؤ ہے، اُس کے ناچ میں جوانی اور روانی ہے،

ع اُڑتے ہوئے شعلے ہیں بہتا ہوا پانی ہے

شمشاد کو شکایت ہے کہ معیاری طوائف مٹتی جا رہی ہے، اب لوگ فن کے قدردان نہیں رہے صرف بازاریوں سے دلچسپی لیتے ہیں یہی وجہ ہے، کہ "خاندانی" کنچن تو اُٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ویشیائیں آ گئی ہیں، ہر کوئی گویا ہے، ہر کوئی رقاصہ ہے، جس نے دو فلمی گیت یاد کر لئے وہ مغنیہ بن گئی اور جس نے بدن ہلانا سیکھ لیا، وہ رقاصہ ہو گئی۔ اگر کسی چیز کو فروغ ہے تو وہ نخش کاری ہے، اس بازار میں پرانے گھر تو گنے چنے ہی رہ گئے ہیں، باقی تمام کوڑا کرکٹ ہے، کچھ بردہ فروشوں کا مال ہے کچھ بدانجام معاشقوں کی پیداوار ہیں، کچھ مفلوک الحال کنبے ہیں، کچھ عادی پیشہ ور ہیں، کچھ کاروباری لوگ ہیں، اور یہ جوان کے ہاں سازندے رکھے ہوتے ہیں محض دکھاوا ہے، اُستاد ہیں تو وہ عطائی، جو فن بڑی ریاضت سے آتا تھا اب اس میں ہر ایرا غیرا اُستاد بنا پھرتا ہے، ناقدری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قدردان اُٹھ گئے ہیں، رہا سہا بھرم فلموں نے کھو دیا ہے، اُدھر جو گویا حورتیں تھیں وہ مر کھپ گئیں،

کچھ وقت کے ساتھ بوڑھی ہو گئیں، کچھ اچھے اچھوں کے حرم میں جا پہنچی گئیں بعضوں کو فلم کے ڈائرکٹروں نے بیویاں بنا لیا، اور جو دو چار بازار میں نظر آتی ہیں، ان کی مٹی فلمی دھنوں اور فلمی گیتوں نے خوار کر رکھی ہے۔ غزل سننے والا تو کوئی رہا نہیں اور پہلے بھی کب تھے؟ چند گنی چنی ہستیاں تھیں جن کی بدولت ہفتہ میں ایک آدھ محفل جمتی وہ شلو کام ہوتے کہ غزل سن آتے ہیں، ہمیں اطمینان ہوتا کہ اچھی صورتیں ابھی بری نہیں ——— اور اب یہ پورا بازار پھر جائے تو مشکل ہے نہ عقل نہیں، اور عقل ہے تو شکل نہیں، بلکہ بڑی حد تک دونوں ناپید ہیں، سہ پہر کو فلم دیکھتی ہیں رات کو وہی گانے اور ناچ دہرا دیتی ہیں، اور پھر وہ اگلے سے لوگ بھی نہیں رہے، جیسا منہ ویسا تھپڑ کوئی خدا کا بندہ گھنٹہ دو گھنٹہ گانا سنے اور سو سوا سو روپیہ دے جائے تو غنیمت ہے ورنہ حالت یہ ہے کہ سات سات آٹھ آٹھ نو دولتوں کی ٹولیاں چندہ جمع کر کے آتی، بیس پچیس روپے ریتی ٹھاٹھ سے نذر گزرانتی اور آوارہ قہقہوں یا دلچسپ آہوں کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں ہر گانے والی جنسی مشین ہے جس سے جو چاہے اور جب چاہے متمتع ہو سکتا ہے، اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں، وقت وقت کی بات ہے، انہیں کیا خبر کہ ان مکانوں میں رسم و راہ کے کچھ آداب ہوتے تھے یا کبھی گویا عورتوں کے ہاں چاندی کے سکے روئی کے گالوں کی طرح

اڑا کرتے تھے،

ممتاز، نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، آپا وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑاتے تھے، لوگ سیانے ہو گئے ہیں، تین سو روپے کے ریڈیو میں زمانے بھر کی رنڈیوں کے گانے سُن لیتے ہیں، اس پر فلمیں مستزاد ہیں، دس آنے سے لیکر تین روپے تک ہر شخص فرقِ مراتب سے رقص و غنا کا لطف اٹھا سکتا ہے، ہندوستان میں ریاستوں کو نہرو نے پیوندِ خاک کیا، پاکستان کے نواب ہیں تو ان پر وہ کہاوت صادق آتی ہے "منہ چکنا پیٹ خالی" جو شوقین مزاج تھے، انہوں نے ڈورے ڈال کر گانے والیوں کو گھر ہی میں ڈال لیا ہے، کوئی نورجہاں لے گیا، کوئی شمیم لے گیا، ایک پنتھ دو کاج، گانے کا گانا کمائی کی کمائی، جن رنڈیوں سے معیاری طوائف کا تصور قائم تھا، وہ، آہستہ آہستہ فلمی دنیا میں چلی گئیں، اب نہ چہرے ہیں نہ آواز اگر کبھی، کوئی اکا دکا، فردوس گوش یا جنت نگاہ کا لطف لینے آ جاتا تھا تو اب وہ بات بھی جاتی رہی ہے، اب تو فلم ہی چاندی ہے، شہرت ہے، روپیہ ہے، اشتہار ہے، غرضیکہ سبھی کچھ ہے، کیا کوئی ترغیب ثریا، مدھو بالا، نرگس، منور سلطانہ، ممتاز شانتی، نمی، صبیحہ اور مہتاب، کو اس بازار میں واپس لا سکتی ہے اور جو خال خال نظر آتی ہیں وہ زندگی کو نہیں گزار رہیں خود زندگی انہیں گزار رہی ہے،

"لیکن موسیقی مر تو نہیں سکتی، وہ تو فطرت کی طرح لازوال ہے، میں نے،

ممتاز کی گفتگو کو قطع کرتے ہوئے شمشاد سے کہا، اور شمشاد بولی :-

جی نہیں، کبھی نہیں ہو سکتی، وہ تو فطرت کے انعامات میں سے ایک انعام ہے، اہم جو بات چیت کر رہے ہیں، وہ طوائفوں کے وجود پہ ہے، تیرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گویا طوائفیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ ـــــــ ؟

ممتاز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا ـــــــ تو وہ ایڈ بٹر ہیں یا لیڈر یا قاضی جی،

تو کیا تمہیں ان پر اعتراض ہے

جی نہیں اور بالکل نہیں

ممتاز کی عادت ہے کہ وہ بات کو بوٹی کی طرح توڑ لیتی اور شوربہ کی طرح بڑھا دیتی ہے،

ان مجلسوں میں ہمارے ایک دوست قاضی صاحب بھی ہمارے ہمراہ ہوتے تھے، ممتاز ان کے ہمیشہ چٹکی لیتی، موقع ملا نہیں، اور کس نے وار کیا نہیں، پھبتیوں کا جھاڑ باندھنے میں بڑی ہی مشاق ہے،

تمام بازار میں اس کے پائے کی ایک بھی حاضر جواب نہیں، عاشورہ کے دنوں میں ان کے ہاں مجلس عزا منعقد ہوئی، ایک نوجوان ذاکر وعظ کے لئے بلائے گئے، ہمیں بھی مدعو کیا گیا، ممتاز نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا،

قاضی نے دیکھا تو کہا، ممتاز آج تو حسین باندی نظر آتی ہو،

ممتاز کو معلوم تھا کہ قاضی مجلس عزا کے خلاف ہے، اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ناک بھوں چڑھا رہا تھا، ——— چھٹتے ہی کہا،

"جی ہاں اور آپ بھی ابن زیاد نظر آتے ہیں"

قاضی صاحب ضرورت سے زیادہ نک چڑھے ہیں، دماغ تو خشک ہے لیکن طبیعت کو بھی خشک رکھتے ہیں، اوّل تو بولتے نہیں، لیکن بولیں تو جلی کٹی باتوں پہ اُتر آتے ہیں، کچھ دوست بیٹھے تھے ایک اور جان پہچان کے دوست آ گئے، ان کی بے ڈھب باتیں سنیں تو پوچھا آپ کی تعریف؟

ممتاز نے مسکراتے ہوئے کہا،

آپ ہیں قاضی جوسؔ قطریرا!

جن دنوں دادی کا پانی منٹو پارک تک آ پہنچا تھا ان کے ہاں باتوں باتوں ہی میں نصف رات گزر گئی، قاضی صاحب نے کہا، چلو بھئی پانی مار کر رہا ہے کہیں یہاں تک نہ آ پہنچے، اور ہم بے گناہ ہی ڈوب جائیں

ممتاز نے برجستہ جواب دیا، قاضی جی اس کے لئے تو چلّو بھر کافی ہے

ممتاز گا رہی تھی، تقریباً سبھی ایڈیٹر اکٹھے تھے ———!

زندگی چال چل گئی شاید

سازندے بے سُرے ہوئے جاتے تھے ممتاز نے ایک دو دفعہ

ٹوکا، جب مجلس ختم ہو چکی، تو قاضی جی نے کہا

آپ کے ہاں اناڑی سازندوں کا ہونا، آپ کی شان کے شایاں نہیں ؟

"آپ کا خیال درست ہے لیکن ان بے چاروں نے تو اب تقسیم کے بعد، یہ کام سیکھا ہے" شمشاد نے کہا،

"تو پہلے، کیا کام کرتے تھے"۔ قاضی جی نے استفسار کیا، ممتاز گنگنا گئی سگریٹ کا دھواں پھینکتے ہوئے کہا

جی یہ پہلے، اخبار میں ایڈیٹر ——— تھے،

ایک بڑے صحافی نے سوال کیا، آپ لوگ اپنے بیاہوں پر اتنا روپیہ صرف کرتے ہیں، آخر یہ کہاں سے آتا ہے

ممتاز مسکرائی، "آپ جیسے شریفوں ہی کی رگیں نچوڑی جاتی ہیں

کچھ بڑی بوڑھیاں جمع تھیں، ایک جھریاں ہوئی عورت نے کہا

"دیکھو تو سہی یہ میرے بازو پر کیا لکھا ہے۔

لکھا تھا، کشن داس چاولہ،

ممتاز نے جلدی میں قمیص کا کف کھینچ کر اس کو ڈھک دیا اور کہا خالہ، خدا کے لئے کسی، اور کو دکھانا کہیں کوئی مسلمان متروکہ جائداد سمجھ کر الاٹ ہی نہ کرالے،

شہناز نے ایک دفعہ اپنا ڈرائنگ روم دکھایا اس میں صرف

چہرے کی آرائش کا سامان ہی ہزار دو ہزار روپیہ کی مالیت کا تھا ممتاز بولی یہ سب "گنج بادروں" کے پھندے ہیں"۔

جو عورتیں پیشہ کماتی ہیں، اُن کے نیچے نک سک میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اسی موضوع پر ایک دن باتیں ہو رہی تھیں،

نوکر بازار سے چائے لایا پیالیاں ایک دوسرے سے مختلف تھیں، شمشاد نے دکاندار کو کوسا ڈالا لیکن ممتاز نے برجستہ فقرہ سے محفل کو زعفران زار بنا دیا

آپ بلا وجہ بگڑتی ہیں، یہ بھی تو اپنی ہی بچیاں ہیں،

بعض دفعہ اُس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بڑے جاندار ہوتے ہیں، اور وہ بے تکلف کہہ جاتی ہے، مثلاً وہ چکلہ کی ٹکیائی کو "رات کا دیپک" طوائف کو "رات کی رانی" میراثی کو "شرافت کی ہچکی"، نائکہ کو "معذرت کے بول"، عشق کو "تندرستی کی اُبکائی"، حُسن کو "مرد کی میراث" مناکحت کو "قید بامشقت"، برات کو "جنازے کی تمہید" اولاد کو "گناہ کی دستاویز"، مرد کو "عیاشی کا مرقع" اور عورت کو "انفعالیت کی تصویر" سمجھتی ہے،

وہ مذاقاً کہا کرتی ہے، اُس کا پیشہ ایک انقلابی مشن ہے اس کی ابتدا کیسے ہی ہوئی ہو لیکن، طوائف نے، ہر دور کی رستی قوتوں کو ڈبویا

ہے اس نے ہر دولت مند سے مزدور کی محنت کا انتقام لیا ہے، جو کچھ جاگیر دار مزارعوں سے لوٹتے رہے ہیں طوائف اس معیشی استحصال کا جنسی بدلہ لیتی رہی ہے اس نے، جاگیرداری نظام کی موت کے قریب لانے میں برابر کا حصّہ لیا ہے، وہ ایک نسل کا انتقام دوسری نسل سے لیتی ہے، وہ جانتی ہے کہ ایک محنت کش سرمایہ دار کے لئے زائد قدر پیدا کرتا ہے، وہ اس زائد قدر، کو جنسی شکنجوں بار کر بتا لیتی ہے، اس کی بدولت سرمایہ دار کی دولت گردش میں رہتی ہے،

معلوم ہوتا ہے تم نے اکنامکس بھی پڑھی ہے۔

میں نے ممتاز سے سوال کیا،

جی نہیں، میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی، میں نے صرف انسان پڑھے ہیں، رنگا رنگ کے انسان —— مثلاً ان گھروں میں کون نہیں آتا، سبھی آتے ہیں، رات کی تاریکی میں آتے اور پو پھٹنے سے پہلے نکل جاتے ہیں وہ لوگ جو دن کو آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں، رات کو پیشانیاں گھستے ہیں، ہر شخص دن کے اجالے میں طوائف کو گندی موری کہتا ہے، لیکن جب رات اپنے بازو پھیلا دیتی ہے تو اسی گندی موری میں سے ان کے بھائی بند پیاس بجھانے چلے آتے ہیں ——!

دس بجے رات کے بعد سے قلعہ کی سیڑھیوں، شاہی مسجد کی میڑھیوں،

اور علامہ اقبالؒ کی قبر کے پاس جو پہرہ دار کھڑے ہوتے ہیں ہمارے بیرونی معزز مہمانوں کی ہوتی ہیں یہ وہی ہیں جن کے قبضۂ قدرت میں بالواسطہ یا بلا واسطہ عنانِ اقتدار ہے، یہ جو ہمارے خلاف شور برپا ہے محض نمائشی ہے۔ مذہب ان لوگوں میں ہوتا ہے، جن کے پاس دولت نہیں ہوتی، اور گناہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جن کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ گناہ نام ہے صرف ہمارے اپنے احساسات کے نشیب و فراز کا، کیا دنیا میں سب سے بڑا گناہ، صرف عورت کا عصمت بیچنا ہے، یا اس کے علاوہ بھی، کوئی قول یا فعل گناہ کی زد میں آتا ہے۔ انسان انسان کا خون چوسے، تو وہ سیاست ہے۔ عوام خواص کو لوٹ لیں، تو وہ دنگا ہے، خواص عوام کو بھڑا دیں تو وہ جنگ ہے، ملّا ضمیر بیچے تو وہ مصلحت ہے، صوفی مداہنت سے کام لے تو وہ ریاضت ہے، لیڈر، قومی سرمایہ ہڑپ کر لیں تو وہ معیشت ہے۔ لیکن عورت بالاخانے پر آ بیٹھے تو وہ سوختنی اور گشتنی ہے۔ گنہگار ہے، فاحشہ ہے، چھنال ہے، چھلاوا ہے۔ الغرض، گناہ کا ایک ایسا پیکر ہے، جس کی نسائیت مر چکی ہے ——— !

میں یہ نہیں کہتی کہ مقابلتہً عصمت فروشی جائز ہے۔ عورت کی عصمت واقعی بڑی شے ہے، اتنی بڑی شے کہ دنیا میں کوئی شے بھی اس کی ہم مرتبہ نہیں ہے لیکن مردوں نے ہمیشہ وجاہت اور کاغذ کی فوقیت کا اس کے

مقابلہ میں چرچا گیا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے، کوئی صاحب کہہ رہے تھے
گنج قارون بھی ہو، تو کنجروں کے ہاں کوڑی کوڑی لٹ جاتی ہے۔ کنچن دھن کے
بغیر کسی کے نہیں، فلاں شخص کروڑپتی، یا لکھ پتی تھا۔ ان کے ہاں برباد ہو گیا، فلاں
دوست ان کے مکانوں میں ہزارہا روپیہ خراب کر چکا ہے، کنگال ہو گیا ہے
طوائفیں نہیں جونکیں ہیں ——!

!—— میں پوچھتی ہوں۔ ممتاز نے سگریٹ کا ایک لمبا
کش کھینچتے ہوئے کہا، عورت کی عصمت زیادہ قیمتی ہے یا دھات کا سکہ
اور اب تو وہ بھی نہیں رہا کاغذی نوٹ ہو گیا ہے۔

آپ ایک عورت سے اس کے حقوق تسلیم کیے بغیر کھیلتے ہیں اس
کی کوئی قانونی مسئولیت آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کو شکایت
ہے، کہ وہ آپ کی جیب سے معاوضہ کیوں لیتی ہے؟ کبھی کسی مرد نے سوچا کہ وہ
کیا دیتا اور کیا لیتا ہے، ہر طوائف کئی کئی خاندانوں کی "امانت دار"
ہے۔ اس کی گود میں، جو بچہ یا بچے ہوتے ہیں، وہ کسی نہ کسی معزز باپ ہی
کی اولاد ہوتے ہیں۔ ان کی مائیں ان کے باپوں کو خوب جانتی ہیں اور
ان کے باپ بھی انہیں جانتے ہیں لیکن ولدیت کے خانہ میں ماں ہی کا نام
لکھا جاتا ہے

——یہاں کوئی شخص اپنی جائز کمائی نہیں لٹاتا اور حلال کی

کمائی کبھی سینکڑوں سے آگے بڑھ نہیں پاتی، جو لوگ یہاں آتے ہیں، ان کے روپیہ پر ان کی مہر ملکیت ضرور ہوتی ہے، لیکن ان کا روپیہ، ان کا روپیہ نہیں ہوتا وہ یا لوٹ کا ہوتا ہے یا چور بازاری کا، یا غریب سے کمایا ہوا اور یا کسی نہ کسی واسطہ سے ہتھیایا ہوا —— لٹنا، لٹانا، ہارنا، گنوانا۔ اس قسم کے جتنے لفظی مغالطے ہیں، وہ سب مردوں کی ذہنی فسطائیت کا نتیجہ ہیں۔ کوئی چیز حرام ہے تو وہ لوٹ کا روپیہ ہے، نہ کہ عورت کی عصمت، مرد کیا دیتا ہے سکہ، اور عورت کیا دیتی ہے عصمت، عجیب بات ہے کہ عصمت پر حرام کی مُہر لگ جاتی ہے، اور سکہ حلال ہوتا ہے۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

مَیں نے کہا ممتاز! تم ایک پڑھی لکھی اور تجربہ کار لڑکی ہو۔ اسی لیے تمہاری زبان فر فر چلتی ہے لیکن کیا تمہاری ہی منطق سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عصمت کا جوہر بیچنے کی چیز نہیں، اور تمہارے ہاں لوگوں کی جیبیں کتر لی جاتی ہیں۔

ممتاز بولی "بس مجھے اس آخری فقرے پر اعتراض ہے، یہ کترنا ٹھیک نہیں، یُوں کہیے خالی ہو جاتی ہیں، اگر آپ اپنے نفس کو تسلّی دینا چاہتے ہیں تو یہ کہہ لیجئے۔

مالِ حرام بود بجائے حرام رفت

اتنے میں اُس کی بعض سہیلیاں آگئیں، اور وہ اپنے مخصوص فقروں سے کھیلنے لگی۔ اِس پر چوٹ، اُس پر چوٹ، کسی پر پھبتی، کسی پر طعن، کسی کو گالی، کسی سے کچھ اور کسی سے کچھ، جب یہ اکٹھی ہوتی ہیں تو ان کا مذاق مردوں کی سطح پر آجاتا ہے،

صفیہ نے کہا۔ ممتاز، رات دیوالی ہے، کہو کیا ارادہ ہے؟

تاشیں منگوائی ہیں، کوئی پنچھی نہ آیا، تو پھر، روپیہ پوائنٹ ——

ممتاز نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ خال خال رنڈیاں ہی پس انداز کرتی ہیں، ورنہ ان کی کمائی جس راستے سے آتی ہے اسی راستے میں صرف ہو جاتی ہے، کچھ لگے بندھے لے جاتے ہیں، کچھ نشوں کی نذر ہو جاتا ہے، کچھ اسراف کے چولھے میں پھک جاتا ہے، کچھ جوئے میں ہر جاتا ہے، اور جو تھوڑا بہت جمع ہوتا ہے، وہ رسموں کے پیٹ میں اُتر جاتا ہے یا بیاہ شادیوں میں تباہی مچتی ہے، کنچنوں کے ہاں خوشی کی رسمیں بڑے ٹھاٹھ سے منائی جاتی ہیں۔

اُس نے بتایا ابھی حال ہی میں اکّی جان نے اپنے بیٹے کی مونڈن کرائی ڈیڑھ ہفتہ بھر مجرا ہوتا رہا، ایک کی خوشی ہو تو ساری برادری کو شریک ہونا پڑتا ہے، سب ناچتی اور گاتی ہیں، ان کے "ملاقاتی" انہیں "سلامیاں" دیتے ہیں، اور اس طرح ہزار ہا روپیہ فراہم ہو جاتا ہے۔ جس گھر میں خوشی

ہو، وہاں کئی دن تک مختلف قسم کے کھانے پکتے اور ایک ایک وقت میں سینکڑوں آدمی شکم سیر ہوتے ہیں۔

——— ہیجڑو والیوں کی شادی میں دس دن تک رقص وغنا کا بازار گرم رہا۔ ہر روز طرح طرح کے کھانے پکتے رہے۔ مختلف رسمیں منائی گئیں ان میں دو رسمیں بڑی ہی عجیب ہوتی ہیں، ایک تو سندلیہ کی رسم جب برادری کی عورتیں جلوس کی شکل میں مختلف گھروں کو بلاوا دینے جاتی ہیں، اور ہر گھر نواکہات ومشروبات سے تواضع کرتا ہے دوسری گھڑا گھڑولی کی رسم ہے، جب برادری کی رنڈیاں ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہوئے قریبی کنوئیں تک جاتی ہیں، اور وہاں پانی کے ڈول نکالتی ہیں ہر شب مجرا ہوتا، اور گئی رات تک رہتا ہے، ہر روز مختلف اللون کھانے تیار ہوتے ہیں۔

پلاؤ اور بھران کی قسمیں۔ موتی پلاؤ، کوکو پلاؤ، چنبیلی پلاؤ۔ نور پلاؤ گلزار پلاؤ، انار دانہ پلاؤ، نورتن پلاؤ وغیرہ۔

مُرغ، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، شیرمال، قورمہ، شامی کباب، مُرغ، مرغابیاں، بٹیر، مربّے، اچار، چٹنیاں، گوشت اور ان کی مختلف قسمیں، بالخصوص پالک گوشت

جب شادی ہو چکتی ہے تو دلہا والے برادری کی عورتوں کو ارمغانی

جوڑے دیتے ہیں، ہجڑو والیوں نے تو اب کے فی گھر ایک ریشمی جوڑا ایک ایک سونے کی انگوٹھی اور ایک ایک چاندی کی پلیٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

"یہ سب دولت کہاں سے آتی ہے"

کہہ چکی ہوں کہ پنچھیوں کی جیب سے، جو لوگ نو گرفتار ہوتے ہیں ہم لوگ انہیں پنچھی کہتے ہیں، جو رسم و راہ میں پختہ ہو جاتے ہیں انہیں طائر آہوتی۔

"یہ آہوتی کیا ہے"

یہ طائرِ لاہوتی کا معکوس ہے، جو میرے ذہن کی ایجاد ہے اور جو محض حاشیہ نشین ہوتے ہیں صرف نظرباز، ان کو کنجروں کی اصطلاح میں چالک کہتے ہیں۔

اور یہ شادیاں کہاں ہوتی ہیں؟

اکثر شادیاں باہر، غربا کے گھرانوں میں ہوتی ہیں۔ کچھ آپس میں بھی کر لیتے ہیں۔

آپس میں؟

جی ہاں! اس بازار میں خاندانی چوباروں میں دو طرح کی عورتیں بیٹھتی ہیں، ایک وہ جو بہو کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً بھائی یا باپ کی بیٹیاں لیکن

ان کی ماں جو بہو کہلاتی ہے، وہ سخت پردے میں رہتی ہے۔ ہمارے ہاں بہو کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ وہ بوڑھی ہو کر بھی پرائے مرد کے سامنے نہیں آتی ۔۔۔۔ دوسری وہ لڑکیاں جو طوائف کے بطن سے ہوتی ہیں، اور ان میں شاذ و نادر ہی کوئی لڑکی بیاہی جاتی ہے۔

"اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بازاریاں، جو خدا جانے کہاں کہاں سے آمری ہیں؟"

ان سے برادری کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہم خود انہیں اچھوت سمجھتے ہیں انہوں نے ہمارے پیشہ کی "لاج" گنوا دی ہے۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہاری دولت مسرفانہ طور پر ضائع ہو جاتی ہے، یہ اسراف کون کرتا ہے؟"

کچھ تو رنڈیاں ہی ایسی ہو جاتی ہیں، مثلاً نصف فی صد کے تو شراب منہ لگی ہوئی ہے، تقریباً نوے فی صد سگریٹ پھونکتی ہیں، ان کی مائیں جو اب نائکہ ہو چکی ہیں، انہیں جوئے کا لپکا ہے، وہ ایک ایک بیٹھک میں سیکڑوں ہار دیتی ہیں، اور جب ہر جاتی ہیں تو شراب پینے لگتی ہیں، اور اس پر خاندان کے مرد مستزاد ہیں، جو پانچوں عیب شرعی ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ صاحبزادیاں خود بھی جوا اور ریس کھیلتی ہیں، ان کے نزدیک پیسہ اور سگریٹ کا دھواں یکساں قیمت رکھتے ہیں۔

"یہ صاحبزادیاں؟" قاضی نے تعریضاً کہا۔

جی ہاں صاحبزادیاں! ایک طوائف ہر دولت مند کے ہاتھ میں عصمت تو بیچ سکتی ہے۔ لیکن گود نہیں۔ ان کی گود میں جو بچے ہوتے ہیں، آپ ان کے ناک نقشہ پر غور کریں تو ان سے بڑے بڑوں کی غمازی ہوتی ہے۔ مثلاً

(۱) ... قلعہ والیاں ... چار بہنیں ہیں اور چاروں ایک راہنما شیخ کی یادگار ہیں۔

(۲) ... ایک بڑے افسر — کی غیر قانونی دختر فرخندہ اختر ہے۔ انہی صاحب کی ایک اور صاحبزادی مشہور فلم سٹار ہے

(۳) ... کی گود میں ایک نامور سید زادے کا بچہ ہے، وہ صاحب لکھ پتی ہیں اور ان کا راج دربار میں بڑا اثر ہے، انگریزی عہد میں اعزازی کرنل تھے۔

(۴) ... دونوں بہنیں ایک بڑے نواب کی چشم و چراغ ہیں دوسری بہن ایک وزیر کے صلب سے ہے۔

(۵) سعیدہ اور محمودہ دو بہنیں ہیں اور ایک بڑے تاجر کی نور نظر محمودہ ایم۔ اے میں پڑھتی ہے۔ اور نیک نام لڑکی ہے۔ سعیدہ (علماء کرام غور کریں) پابند صوم و صلوٰۃ ہے، اور ہمیشہ عشاء کی نماز پڑھ کے مجرا پر بیٹھتی ہے اس کے چہرے پر اب بھی ایک خاندانی عورت کا روپ ہے اس کی گود میں آزاد ہند فوج کے ایک میجر جنرل کا یادگار بچہ ہے۔ اور وہ اس کو مستقل

کی اُمید میں پال رہی ہے، اُس کے قلب میں ایک کانٹا ہے، کہ مرد کے وعدے برسات کی دھوپ چھاؤں ہوتے ہیں۔

(۶) . . . . سندھ کے ایک بڑے زمیندار کی غیر شرعی بیٹی ہے جس سے اُسی زمیندار کا شرعی بیٹا متمتع ہوتا ہے۔

(۷) . . . . . دونوں ایک مرشد زادے کی "بیٹیاں" ہیں۔ ان کی گدی بڑی نامور ہے اور ان کے مرید بڑے باصفا ہیں۔

(۸) اور ہاں وہ دیکھئے، اُس مکان میں تیکھے نتھنوں والی ایک لڑکی ہے وہ ایک بڑے لیڈر کی صاحبزادی ہے، اس کے پہلو میں ایک مکان ہے ابھی اُس کے ہاں ایک بچی ہوئی ہے، وہ آپ کے ایک ہم قلم بھائی کی تصنیف ہے۔

(۹) . . . . . تینوں بہنیں بہو کی بیٹیاں ہیں، لیکن تینوں کے تعلقات مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے رہے ہیں۔ کبھی کوئی بڑا نواب، کبھی کوئی بڑا سردار، کبھی کوئی بڑا افسر، کبھی کوئی بڑا زمیندار، کبھی کوئی بڑا تاجر، کبھی کوئی بڑا ٹھیکہ دار۔ ع ———

ان کی شریانوں میں کن کن کا لہو جاری ہے

ایک بہن کی گود میں سرحد کے ایک بڑے نواب کی "نورچشم" ہے دوسری بہن کے کئی بچے ہیں اور سب ایک ——— کے چشم وچراغ

ہیں تیسری بہن کی نتھ اتروائی ــــ کے ایک بہت بڑے ــــ
نے دس ہزار روپیہ کے معاوضہ میں کی، لیکن اب وہ ایک جاہلِ مطلق لکھ پتی
پٹھان کی داشتہ ہے، یہ خاندان اس طوائف کا صحیح نمونہ ہے، جس کا
بھیانک تصور معاشرہ میں زبان زدِ عام ہے۔ ان کے مکان میں کئی خودکشی
کر چکے ہیں۔ کئی اجڑ پجڑ کر انہی کے ہاں چلم بردار ہیں۔ کئی اسی بازار میں خوانچے لگاتے
ہیں۔ کئی تکیہ میں چانڈو یا چرس یا بوٹی پیتے اور بسر اوقات کرتے ہیں، ایک
دو اسی بازار کے مرے ہوئے تانگہ چلاتے ہیں۔

الغرض تمام بازار شرفا کی کیاریوں سے بھرا پڑا ہے۔

> افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
> خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

"اور یہ نتھ اتروائی کیا ہے؟"

جب تک کوئی "طوائف" کنواری ہوتی ہے، اس کی ناک میں نتھ
رہتی ہے، جب وہ بلوغ کو پہنچتی ہے، تو اس کی شادی کو نتھ اتروائی کہتے
ہیں۔ کوئی مرد خواہ وہ اس کے باپ یا دادا ہی کا ہم عمر کیوں نہ ہو، ایک مطلوبہ
لیکن گراں رقم ادا کرنے سے "سہاگ رات" رچا سکتا ہے۔ عموماً بوڑھے

عاشق "ہی "جوان بیٹیاں" ڈھونڈھتے ہیں۔

"کیا اس موقع پر آپ لوگ شادی کی تقریب بھی رچاتے ہیں؟"

"صرف گھٹیا کمین شموں شاں ضرور کرتے ہیں، لیکن بڑے نہیں۔ اس میں کوئی خوبی یا خوشی کا پہلو تو ہوتا نہیں۔

"نتھ اتروائی کی اُجرت کیا ہوتی ہے؟"

"جیسا مال ویسی قیمت۔ کبھی تو پچاس ساٹھ ہزار روپے بھی تھوڑے ہوتے تھے، لیکن یہ بادشاہتوں اور ریاستوں کے دورِ اقبال کی بات ہے۔ اب بھی ایک آدھ گھرانا دس بارہ ہزار روپیہ لیتا ہے۔ اور دو اڑھائی ہزار روپے کا کاروبار تو عام ہے لیکن آج کل سرد بازاری ہے۔ پنجابی خانہ بدوش قسم کے عیاش ہیں، ان کا متوسط کاروباری طبقہ جسم و آواز کی عارضی عیاشی کرتا ہے سندھ کے بڑے بڑے زمیندار معدودے چند ہیں، لیکن ان کی عیاشی ساون بھادوں کی ہے۔ البتہ سرحد کے بعض خوانین سدابہار عشق کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں دولت چھپی پڑتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف تعدد ازدواج کے قائل ہیں بلکہ ایک آدھ رنڈی کو گھر میں ڈالنا بھی جزوِ زندگی سمجھتے ہیں، لیکن انکا کا "ہوا" پانی نہیں مانگتا —— پچھلے ایک برس میں کوئی تیس رنڈیاں ان کے ہاں گئیں اور نکاح پڑھا لیا، لیکن ایک برس کے اندر اندر سبھی لوٹ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کو دق ہو گئی ہے۔

ممتاز نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا

"پنجابی کا عشق بھنورے کا عشق ہے، سندھی کا عشق مکھی کا عشق ہے، اور پٹھان کا عشق چمگادڑ کا عشق۔"

موسیقی

موسیقی تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ زبان ہے

! ——— (لانگ فیلو)

شمشاد نے کہا، موسیقی اور عورت میں چولی دامن کا ساتھ ہے جن منزلوں سے عورت گذری، انہی منزلوں سے موسیقی، کبھی غنا عبادت کا جزو تھا، بلکہ بعض روایتوں کے پیش نظر غنا کی تخلیق ہی عبادت کے لئے ہوئی ہے، لیکن آج اپنی فنی عزت کے باوجود ایک پیشہ ہے ——— آواز اور جسم دونوں بکاؤ چیزیں ہیں،

ہر کوئی گانے کی تاثیر کا قائل ہے، لیکن سوسائٹی میں جو عزت ایک گویّے یا گائن کی ہونی چاہئے، وہ نہیں ہے عوام غنا کو جنس اور مغنی یا مغنیہ کو دکاندار سمجھتے ہیں، ——— !

؟؟ ——— یہ معلوم کرنا تو بڑا مشکل ہے، کہ چکلے میں عورت پہلے آئی ہے یا موسیقی یا دونوں ایک ساتھ، لیکن یہ صحیح ہے کہ دونوں میں قافیہ ردیف کا تعلق رہا۔ عبادت گاہوں میں بھی عورت، رقص، غنا اکٹھے رہے اور بالاخانوں میں بھی اکٹھے ہیں ——— جب تک موسیقی کا تعلق دھرم یا مذہب سے رہا دیو داسیاں باقاعدہ فنی تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ وہ بہترین مغنیہ و رقاصہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح رقص و غنا کا حصول جواری کے محاسن یا فرائض میں سے تھا۔ چنانچہ کنیزوں میں بڑی بڑی نامور مغنیہ ہوئی ہیں۔ ایک خاص دور میں تو خود شاہی بیگمیں، موسیقی میں استعداد بہم پہنچایا کرتی تھیں۔

جہانگیر کی بیوی، اور شاہجہان کی ماں، مان متی کو موسیقی میں جو استغراق رہا، یہ اس کا اعتراف تھا کہ جہانگیر نے خواصوں کا ایک طائفہ تعلیم و تربیت کے لیے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ مامون الرشید کی بہن علیہ کو موسیقی میں مجتہدانہ کمال حاصل تھا، اس کے متعلق عربوں کا دعویٰ تھا کہ ساری دنیا میں اس کے پایہ کی مغنیہ موجود نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے جانشینوں میں بیشتر نے گویا عورتیں اپنے حرم میں ڈال رکھی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی شہزادے بھی اسی ڈگر پہ چل نکلے تھے۔ آخری دور میں تو یہ حال تھا کہ مغنیہ اور مغنی عام تھے، صناع اور سپاہی ناپید —! یہ تو خیر محلوں کی دنیا کا حال ہے اور اس کے تذکرے تاریخ کے صفحوں

کو ٹھنگا لینے سے مل ہی جاتے ہیں۔ خود طوائفوں میں بڑے پلے کی گویّا ہوئی ہیں۔ لتا تو خیر کسی اچھے گھر کی آبرو ہے، نور جہاں کی آواز پر دل کھنچے جاتے ہیں؛ منور سلطانہ نے نورانی گلا پایا ہے۔

بازار کا روپ تو بازاریاں چاٹ گئی ہیں، لیکن مختار واقعی بائی ہے۔ فریدہ کا سن آغاز ہے، لیکن ناچتی خوب ہے۔ اور گاتی بھی خوب ہے۔ الماس کی آواز بھی بُری نہیں۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے، دہلی سے اختر جہاں اور اس کی دو بیٹیاں، نایاب اختر اور آفتاب اختر آئی ہیں، انہیں بھی سوجھ بوجھ ہے، اختر جہاں خود تو بڑی سمجھدار ہے، لیکن نایاب بھی غنا کے تیور جانتی ہے۔ جہاں تک ستار بجانے کا تعلق ہے، اس بازار میں اس کی ہم مرتبہ کوئی نہیں، وہ پکا راگ بھی جانتی ہے۔

لیکن یہ پکا راگ ؟

شمشاد نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

میں سمجھتی ہوں کہ آپ اس کو آواز کی قحبہ گری پر محمول کرتے ہوں گے، لیکن یہ وجدان کی چیز ہے، حقیقی راگ تو پکا راگ ہی ہے، یہ جو آپ سنتے ہیں صرف شاعری ہے، جس کو ہر کوئی اچھے سُروں میں گا لیتا ہے۔ جن لوگوں کو راگ یا راگنیوں میں درک ہے وہ ان کے سحر کو بخوبی سمجھتے ہیں، یہ کمال صرف راگ ہی میں ہے کہ وہ ایک موسم میں دوسرے موسم کی یاد تازہ کرتا اور انسان کے ذہن

کو ایک مجرد کیفیت میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت بڑے غلام علیخاں اپنے فن میں یگانہ ہیں، لیکن وہ نائک یا گندھرپ نہیں گنی ہیں۔

"یہ نائک، گندھرپ یا گُنی کا مطلب کیا ہے؟"

نائک موسیقی کے علامہ فہامہ کو کہتے ہیں، وہ شخص جو سنگیت کا علم جانتا ہو، دوسروں کو پڑھا سکے، خود تمام راگ گا سکتا ہو، دوسروں کو سکھا سکے، جو کچھ اسلاف نے موسیقی میں پیدا کیا ہے اس میں حک و اضافہ کر سکے، اس کو نائک کہتے ہیں۔ آج تک صرف تیس نائک ہوئے ہیں، جن میں خسرو، بیجو باورا اور واجد علی شاہ بھی شامل ہیں۔

گندھرپ، وہ ہے جو کل راگ جانتا ہو، لیکن خود مجتہد نہ ہو۔

گُنی، وہ ہوتا ہے جو صرف اپنے ہی ملک کے راگ گا سکتا ہو، لیکن اس کی نظر مارگ راگوں پر نہیں ہوتی ہے۔

ان سے نیچے، کلاونت کا درجہ ہے، جو دُھرپد اور تروٹ گاتا ہے۔ جو ٹپہ، ٹھمری، خیال اور غزل گائے وہ قوال ہوتا ہے، تان سین، سجان خاں، چاند خاں وغیرہ گندھرپ کے درجے میں تھے۔"

"اور یہ بائی کا مفہوم کیا ہے؟"

ممتاز نے عادتاً چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ بائی کا مفہوم ہے

By the way

"لطیفہ اچھا ہے، لیکن بائی ہے معزز لفظ؟"

"جی ہاں معزز تو ہے، لیکن بعض لفظوں کی شہرت زمانہ کی ٹھوکروں سے داغدار ہو جاتی ہے۔ مثلاً خلیفہ کا لفظ ہے، اس کے ساتھ ایک عظمت وابستہ ہے، مگر اب ہر اُس شخص کو خلیفہ کہتے ہیں، جو پاؤں توڑ کے بیٹھا ہو، ایک بیکار وجود، ——— !

بائی غالباً گجراتی کا لفظ ہے۔ اس کا صحیح مادہ ایک گجراتی ہی بتا سکتا ہے، لیکن جیسے ترکی میں ہر عورت کو خانم کہتے تھے، یا ہمارے ہاں بیگم کا لفظ مروج ہا اسی طرح بائی کا لفظ ہے۔ اب بھی راجپوت یا گجراتی ہندو عورتوں کے نام میں بائی کا لفظ ہوتا ہے۔ گاندھی جی کی اہلیہ محترمہ کا نام کستورا بائی تھا، راجہ مان سنگھ کی بیٹی جو اکبر کے حرم میں تھی اُس کا نام جودھا بائی تھا، ممکن ہے، مسلمان اُمرا، نے بیگم یا خانم کے لفظوں کی عزت محفوظ رکھنے کے لئے لسانی تعصب میں بائی کا لفظ استعمال کیا ہو، ——— ؟

؟ ——— "آج کل عورتوں میں اچھی گائک کون ہے؟"

"وہ تو آپا بتا چکی ہیں" ممتاز نے سگریٹ کے دھوئیں کو حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا ——— آپا خود بھی بڑی گنی رہ چکی ہیں۔

شمشاد نے ایک سرد آہ کھینچی، جیسے کہہ رہی ہو۔ ع

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

——— اور بات کو اٹھاتے ہوئے کہا

میں یہ تو نہیں کہتی کہ مجھ سا کوئی نہ تھا۔ لیکن بڑے بڑے دہلیز سے آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ ایک دفعہ آنجہانی مہاراجہ اندور ہمارے گھر چلے آئے تھے۔ کئی دفعہ شہزادہ معظم جاہ کے بلاوے پر حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ ہفتوں قیام رہا۔ خود میر عثمان علی خاں کئی مجلسوں میں قدم رنجہ فرماتے تھے۔ معظم جاہ کا مزاج شاہانہ تھا۔ جب تک قیام ہوتا، روزانہ ایک زرتار ساڑھی، چند اشرفیاں اور کوئی نہ کوئی طلائی زیور انعام فرماتے۔ لیکن حضور بندگان عالی متعالی، پرلے درجے کے کنجوس تھے، کبھی کسی کو چھوٹی کوڑی تک نہ دی۔

——— ایک دفعہ میں گا رہی تھی، غزل کا کوئی شعر پسند آگیا۔ حضور نے جیب میں ہاتھ ڈالا، حکم ہوا شمشاد آگے آجاؤ۔ میں نے فرشی سلام کیا۔ لوگ متحیر تھے، کہ زندگی میں پہلی دفعہ اعلحضرت کسی کو انعام بخش رہے ہیں؛ لیکن صرف اتنا کیا کہ کیسہ میں سے قوام کی ڈبیا نکالی اور پوچھا پان کھاتی ہو؟

عرض کیا، جہاں پناہ! عادت تو ہے،

فرمایا، جاؤ تمہیں پان کھانے کی اجازت ہے، اور یہ لو قوام۔

دستور تھا کہ جب اعلیٰ حضرت کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو ان کے سامنے کوئی شخص پان کھانے کی ہمت نہ کر سکتا تھا، اور یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔

شمشاد نے پھر ایک سرد آہ بھری، اور بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

اب وہ دن خواب کی طرح بیت چکے ہیں جوانی جا چکی ہے۔ بڑھاپا آ رہا ہے اور بڑھاپا اصلاً جوانا مرگی ہے۔

• • •

"آپ موسیقی کی تاریخ جانتی ہیں؟"

مختار نے یہ سمجھا کہ میں اس سے موسیقی کے اجزا پوچھ رہا ہوں چنانچہ اس کا جواب نہایت مختصر تھا۔

"موسیقی کا مدار ارکان ثلاثہ پر ہے، لَے، تال اور سُر" لیکن جب میں نے اپنے سوال کی وضاحت کی، تو اس نے کہا ——— !

! ——— آپ جانتے ہیں، مَیں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ آغا حشر کاشمیری کی رفاقت میں بسر کیا ہے، وہ میرے راہنما بھی تھے۔ شوہر بھی تھے، اُستاد بھی تھے، اور محبوب بھی، وہ ایک فاضل اجل تھے۔ جب موڈ میں ہوتے تو باتوں کے دھنی تھے۔ کسی موضوع پر طبیعت بند نہ تھی۔ ہر فن کی روح کو سمجھتے تھے، ایک دن بہت سے دوست جمع تھے۔ کسی نے سوال کیا۔

"آغا جی! غنا کا موجد کون ہے؟"

فرمایا ——— فطرت! اور پھر کیا تھا، ایک دریا موج میں آگیا، کہنے لگے انسان کو بولنا، ہنسنا اور رونا تو پہلے دن ہی ودیعت ہو چکا تھا، ان کے

امتزاج، یا ترکیب سے گانا بھی مل گیا، فطرت کے مظاہر پر غور کیا تو ہواؤں کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، بادلوں کی گھن گرج، لَے، تال اور سُر کے علامات تھے، جس سے موسیقی اور انسان میں تال میل ہو گیا

موسیقی یونانی لفظ ہے اور موسیٰ سے مشتق ہے، معنی ہیں ایجاد کرنا، یا پیدا کرنا۔ جس طرح اردو، فارسی، عربی میں نسبت کے لئے یائے معروف لگا دیتے ہیں اسی طرح لاطینی اور یونانی میں ق لگایا جاتا ہے۔ عربوں نے موسیقی کے حرف نسبت پر تو غور نہ کیا، لیکن ایک اور یائے نسبتی بڑھادی، جس سے موسیٰ موسیقی ہو گیا۔

بعض نکتہ طرازوں کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ نے پتھر پر جو عصا مارا تھا، اور جس سے پانی کی بارہ نہریں یا سات چشمے پھوٹ نکلے تھے اُس سے زیر و بم کی جو مختلف صدائیں پیدا ہوئی تھیں ——— موسیٰ نی حقی۔ حضرت موسیٰ نے انہیں یاد کر لیا اور وہ آوازیں ہی موسیقی کے سات یا بارہ سُر ہیں۔

فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ اہل فارس کے نزدیک موسیقی کا موجد حکیم فیثاغورث ہے جو حضرت سلیمان کا شاگرد تھا، لیکن اس کی تغلیط ہوتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی کتابوں میں بھی موسیقی کے وجود کا سراغ ملتا ہے، ہندوؤں کے ہاں موسیقی کے لیے سنگیت کا لفظ ہے، جس کے

مفہوم میں گانے کے علاوہ ناچ اور بتانا بھی ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ موسیقی کے موجد دیوتا تھے، اور سنگیت کے موجد شوجی مہاراج —— بھرت رشی نے یہ علم اپسراؤں (جنتی رقاصاؤں) کو سکھایا، نارد رشی نے انسان کو سکھایا، چنانچہ اندر کے دربار میں، جو لوگ رقص و غنا پر مامور تھے ان میں سے رقاصہ کو اپسرا، گویے کو گندھر اور سازندے کو کنر کہتے تھے، اس کے برعکس ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ اس کے مخترع مہا دیو ہیں، ان کی خدمت میں چھ دیو اور تیس پریاں رہتی تھیں، ان کا کام صرف گانا بجانا تھا۔ چھ دیو، چھ راگ ہیں۔ بھیروں۔ مالکونس، ہنڈول، دیپک، میگھ اور سری، علی ہذالقیاس پریوں کے نام بھیرویں، ٹوڈی، اساوری، اور رامکلی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ ناٹکوں کی مخترعات ہیں، جنہیں پتر (بیٹا) اور بھاوجا دبھو ہا کہتے ہیں۔ ہندوستان میں موسیقی کا پہلا نقش سام وید کے منتر ہیں جن کو رگ کہتے ہیں۔ مصریوں کا دعویٰ ہے کہ موسیقی اور سازوں کے موجد ان کے دیوتا ہیں، اور ایک یونانی حکیم نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ لیکن یونانیوں کو اصرار ہے کہ ان کے دیوتا زیوس کی نو بیٹیاں میوزس اس کی بانی ہیں اور انہی کے نام پر میوزک یا موسیقی کا لفظ بنا ہے۔

توراۃ سے بنی اسرائیل کے اشتغال موسیقی کا پتہ چلتا ہے، حضرت آدم سے ساتویں پشت پر جوبل نام کا ایک شخص ہوا ہے اُس کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ وہ چنگ وارغنون کا بانی تھا، حضرت داؤد کے مزامیر مشہور ہیں
انہوں نے مذہبی رسوم کی ادائی کے لیے موسیقی کی چوکیاں مقرر کی تھیں، چنانچہ
اس زمانے میں چنگ، رباب، طنبورہ، جھانجھ، قرنا، تُرہیوں وغیرہ کی
موجودگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حضرت سلیمان کے عہد میں بھی، موسیقی کا زور
بندھا رہا، پھر کچھ دیر کے لیے اس کی ہوا اکھڑ گئی، اور معابد یہود سے موسیقی
کا فن قطعاً علیحدہ ہو گیا۔

یونان کے بعد روما میں، موسیقی کو عروج حاصل ہوا، اور وہ بہت
کچھ آگے نکل گئے۔ رومیوں ہی سے ایرانی متاثر ہوئے، اور بڑا نام پایا۔
خود عربوں کا فن موسیقی کچھ نہ تھا، اُن کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی
سے ماخوذ ہے۔

ابو مسیحج پہلا عرب تھا جس نے فارس اور روم کے شہروں سے موسیقی
کا سرمایہ جمع کیا۔ اور پھر حک و اضافہ سے عربی میں سہل و سادہ دھنیں قائم
کیں، اس کے بعد اسحٰق موصلی جیسا نامور مغنی پیدا ہوا، جس کے کمالِ موسیقی
کا شہرہ اُس عہد کے اطراف و اکناف میں تھا۔ ابو نصر فارابی نے
قانون پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، ابن سینا اس فن کا اتنا بڑا باکمال
تھا کہ شہنائی اسی کی ایجاد ہے۔

چونکہ موسیقی الفاظ و معانی کی چیز نہیں، بلکہ اس کا تعلق الحان و ایقاع

سے ہے، اس لیے حرف و لفظ اس پر قادر نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ فاتح قومیں مفتوح قوموں میں اپنا فن موسیقی منتقل نہیں کر سکی ہیں۔ بلکہ ان میں گھلنے ملنے کی وجہ سے انہی کے رنگ میں رنگی گئی ہیں۔ اس کی بڑی مثال ہندوستان کی مسلمان بادشاہتیں ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی سنگیت کا بہت بڑا اثر قبول کیا، چند برائے نام تبدیلیاں کیں، لیکن وہ تبدیلیاں جڑ میں نہیں شاخوں میں تھیں، چنانچہ مسلمان بادشاہتوں میں خلجی اور تغلق خاندانوں کی موسیقی سے دلچسپی کے واقعات عام ہیں۔ جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن اعتنا کیا وہ شرقی خاندان تھا۔ سلطان حسین شاہ شرقی نے موسیقی میں بعض نئی طرحیں لگائی ہیں، ان کے علاوہ بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں نے اپنے شوق و ذوق کو نمایاں کیا۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو ظہوری نے جگت گرو کہا ہے۔

مغلوں میں اکبر کا عہد گویّوں اور مغنیوں کی سرپرستی کے لیے مشہور تھا۔ جہانگیر خود موسیقی کی نوک پلک سے واقف تھا۔ تمام ملک میں دہلی، آگرہ، لاہور، بیجاپور، احمد نگر اور احمد آباد کے گویّے امراء کے ہاں ملازم تھے۔ علاء الملک تونی اورنگ زیب کے وزراء میں سے تھا، لیکن موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ اس کی صحبت میں بیٹھتے تھے، ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک موسیقی کے نکتہ شناسوں

ہیں تھے۔ انہوں نے تان سین کا گانا سُنا تو صرف یہ کہا تھا: ہاں گا لیتا ہے،
——— ملا عبدالقادر بدایونی بین بجانے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔
ملا عبدالسلام لاہوری، علامہ سعداللہ شاہجہانی، شیخ علاؤالدین موسیقی
کے فاضلوں میں سے تھے۔ بیرم خاں کو موسیقی سے جو شغف رہا اس کی
شہادت اس کے بیٹے عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضیوں سے ملتی ہے۔ شیخ
سلیم چشتی کا پوتا اسلام خاں جہانگیر کے عہد میں بنگال کا گورنر تھا۔ وہ اسی ہزار
روپیہ سالانہ صرف رقص و سرود کے طائفوں پر خرچ کرتا تھا۔ شہزادہ
مراد بخش کو اورنگ زیب نے قید کیا اپنے ہمراہ سرس بائی کو لے
گیا۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے خیال گانے والوں میں اس کا
ثانی نہ تھا۔ دورِ آخر میں مظہر جانجاناں اور میر درد بڑے مشاق تھے۔ ان
کے ہاں بڑے بڑے کلاونت اصلاحیں لیتے تھے ———

——— مختار آغا کی تقریر سنا رہی تھی اور میں بڑے غور سے اس
کے چہرے کو تک رہا تھا، جوانی مرچکی ہے، لیکن آواز نہیں مری۔ اس میں ابھی
تک عمرِ رفتہ کو آواز دینے کا حوصلہ موجود ہے۔

• • •

اختر جہاں ایک میجر کے نکاح میں ہے۔ آفتاب اختر ایک رئیس
ابن رئیس کی ملازم ہے۔ نایاب اختر کی نوک پلک اچھی ہے اشتہائی

رنگ ہے۔ گاتی خوب ہے، ناچتی نہیں، اس کی کم سخنی ضرب المثل ہے، لیکن اختر کی ماں اور ان کی نانی ایک جہاندیدہ نائکہ ہے۔ ایک زمانہ بتا چکی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھرّیاں اس کی مرحوم جوانی کے سنگھار کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ اس سن و سال میں بھی ایک شاہی کھنڈر معلوم ہوتی ہے جب کوئی فرد یا جمعیت گانا سننے آتی ہے، تو وہ سب سے پہلے اس کا ایک جائزہ لیتی ہے، ایک طرف استاد فرد کش ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بیٹھتی ہے، مراد آبادی پاندان سامنے رکھا ہوتا ہے، خود پان بناتی اور خود ہی پیش کرتی ہے۔ لیکن جب جانے پہچانے لوگ ہوں تو فوراً ہی نایاب کو بلا لیتی ہے، نایاب سمٹے ہوئے ریشم کی طرح آتی، ہاتھ کو قوس بناتے ہوئے سلام کرتی اور سنبل کے ڈھیر کی طرح بیٹھ جاتی ہے، اس کی بڑی بڑی گول آنکھوں پر، اس کی دراز پلکیں جھکی رہتی ہیں، نایاب واقعی غنچہ دہن ہے، ستار خوب بجاتی ہے۔ پکا راگ بھی گا لیتی ہے۔ لیکن یوپی کے دھان پان شاعروں کی ہلکی پھلکی غزلیں خوب گاتی ہے، اس کی صحبت میں اب بھی دہلی کے بعض کرخندار نواب، اور وضعدار اہل قلم بیٹھتے ہیں، اختر جہاں بڑی مجلس آرا ہے، تمام کنبہ ٹھیٹھ اردو بولتا ہے، اختر نے نایاب سے کہا، چائے بنوا لو،——

کچھ وقت ہو گیا تو اختر نے نایاب سے پوچھا، چائے بن گئی ہے؟ اس نے کہا، اسٹو پر کیتلی رکھی ہے، ممزی پتی لینے گیا ہے، اور کچھ عرصہ گذر گیا،

اختر نے کہا، چائے تیار ہوگئی؟ وہاں ابھی پانی گرم ہو رہا تھا۔ نایاب بولی "ابھی تو پھول بھی نہیں پڑے ہیں"

غرضیکہ ان کے ہاں بات چیت نہایت شستہ ہوتی ہے۔ وہ گنوارپن جو اس بازار کی عام خصوصیت ہے، سارے گھر میں نہیں، دونوں بہنیں ایک ہفت روزہ جریدہ "رقص و سرود" نکالتی رہی ہیں، اب لاہور سے کراچی چلی گئی ہیں۔

نایاب کا خیال ہے کہ حکماء نے موسیقی کا فن موسیقار سے ایجاد کیا ہے۔ اس پرندے کی عمر ایک ہزار برس ہوتی ہے۔ اس کی چونچ میں سات سوراخ ہیں، جب اپنی عمر طبعی کو پہنچتا ہے تو گھانس پھونس اکٹھی کر کے اس کے ارد گرد ناچتا اور پھڑکتا ہے، اس کی نے سے انبار میں آگ لگ جاتی ہے، خود اس میں بھسم ہو جاتا اور پھر اسی خاکستر سے دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ اس پرندے کو عربی میں ققنس، یونانی میں فینقس، پارسی میں آتش زن، اور سنسکرت میں دیپک لاٹ کہتے ہیں۔

اختر جہاں کا کہنا ہے کہ ساتوں سُر سات جانوروں کی آواز سے نکلے ہیں۔ کھرج مور کی آواز سے، رکھب پپیہے سے۔ گندھار بکری سے، مدہم کلنگ سے، پنچم کوئل سے، دھیوت گھوڑے سے اور نکھار ہاتھی سے۔

خواجہ نے کہا، اس بازار سے جتنی معلومات بھی، موسیقی کے متعلق

حاصل ہوئی ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ موسیقی مردوں کی ایجاد ہے اور مردوں ہی نے اسے پروان چڑھایا ہے۔

جی ہاں، اختر جہاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا، خود یہ بازار بھی مردوں ہی کی تصنیف ہے اور بالاخانوں کو بھی مردوں ہی نے پروان چڑھایا ہے۔

خواجہ نے کہا، غالباً آپ اس کو تعریض سمجھ رہی ہیں، مَیں تو واقعہ عرض کر رہا ہوں،

تو میں نے بھی تعریضاً نہیں کہا۔ جو کچھ کہا ہے وہ واقعہ ہی ہے ——

اختر جہاں نے جواب دیا —— !

قاضی بولا" دیکھیے نا، رقص و غنا اس وقت سہ آتشہ ہو جاتے ہیں جب انہیں ایک حسین عورت اختیار کرتی ہے،

—— اختر جہاں بولی، آپ درست فرماتے ہیں، اگر معلمی سے قطع نظر کر لی جائے تو سنگیت عورتوں کی چیز ہے۔

"یہ رقص کا موجد کون ہے؟"

اس کا موجد بھی انسان ہے۔ بظاہر اس کی کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن رقص و غنا دونوں ہم عمر، اور ہم رشتہ ہیں۔ کبھی رقص منجملہ عبادات تھا اور توریت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اب اس کی حیثیت فنی ہو گئی ہے۔ قدم الایام میں، بیت المقدس کے ایک یہودی فرمانروا نے بردویا

نام کی رقاصہ کے ناچ سے متاثر ہو کر کہا، مانگ کیا مانگتی ہے؟ اُس نے
بپتسمہ دینے والے یوحنا کا سر مانگا اور لے کے دم لیا۔ مصر کے ابتدائی
طائفوں میں جو رقاصائیں تھیں اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ خاندان برامکہ میں سے ہیں،
ہندوستان میں رقاصاؤں کو مُرلیاں کہتے تھے۔ جب پہلی دفعہ عرب تاجر
ملتان میں وارد ہوئے تو ان کے ناچ کو دیکھ کر اسیر ہو گئے۔ القصہ جیسے جیسے
موسیقی میں دُھنیں بنتی گئیں ویسے ہی رقص میں گتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اب رقص
حدِ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ جہاں موسیقی کو چپ لگتی ہے وہاں رقص بولتا ہے،
لیکن غنا کی طرح ایک قوم کا رقص بھی دوسری قوم سے مختلف ہوتا ہے۔

"کیا اس بازار میں بھی کوئی رقاصہ ہے؟"

"آپ جانتے ہیں ہم لوگ دہلی سے آئے ہیں اور پناہ گزین ہیں، یہ ایک
مکان (کھچراج منزل)، دو سو روپیہ ماہوار پر مل گیا ہے۔ کچھ دنوں محکمہ آبادکاری
کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ لیکن دفتروں میں تو شرفا خوار پھرتے ہیں، اور ہم ٹھیریں
طوائفیں۔ چار و ناچار اس مکان میں بیٹھ گئے، جو کچھ پس انداز کیا ہوا تھا وہ
کھا رہے ہیں۔ جو لوگ آتے ہیں، انہیں آداب کا علم نہیں، جو مُنہ میں آتا ہے
کہہ ڈالتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ پوچھ رہے تھے کہ اس بازار میں بھی کوئی رقاصہ
ہے۔ دو چار کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اچھا ناچ لیتی ہیں۔
شہناز، فریدہ، الماس، کا کو، ——

کاکو، گاتی تو واجبی سا ہے، لیکن ٹھرکنا خوب جانتی ہے، یہ جو آپ لوگوں میں مشہور ہے کہ طوائف جونک ہوتی ہے، تو واقعی یہ بعض خاندانوں پر صادق آتا ہے، وہ لوگ انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی مرد کی گرہ میں ہے، لے لو، اور پھر دھتکار کر رخصت کر دو، مثلاً..

... سات بہنیں ہیں۔ اسی بازار میں ان کی حویلیاں کھڑی ہیں، ہر کہیں پہنچ سکتی ہیں، لیکن گفتگو ہے تو ملمع، صورتیں ہیں تو سہانی، دل ہیں تو سنگی جب کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کرتی ہیں تو سیفٹی ایکٹ سے زیادہ بے رحم ہو جاتی ہیں۔

"لیکن یہ تو ہر طوائف کا شیوہ ہے۔ کوئی رنڈی بہ استثنا کسی مالدار سے محبت نہیں کرتی"

"آپ کا خیال درست ہے؛ لیکن فقدانِ محبت کے باوجود شرافت برتی جا سکتی ہے"

"اگر شرافت سے مراد زبان کی مٹھاس ہے، تو وہ دو چار مکانوں سے قطع نظر ہر کہیں ہے، اور اگر شرافت میں دل کا اخلاص بھی شامل ہے تو مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے۔ جب لوگ ان مکانوں میں آتے ہیں تو وہ شہنشاہ ہوتے ہیں، اور جب ان کی گنی کٹ جاتی ہے تو ان کی زندگی صرف ایک نقل رہ جاتی ہے"

• • •

الماس کی آواز بڑی گونجدار ہے، چہرے پہ جوانی کی تمکنت ہے۔ غالب خوب گاتی ہے، حفیظ غمزے سے پڑھتی ہے۔ ع

ابھی تو میں جوان ہوں

اس کی موسیقی سے متعلق واقفیت کچھ زیادہ نہیں البتہ طبلے کی تھاپ، طنبورے کی آس، ہارمونیم کی صوت، اور سارنگی کے لہرے کو خوب جانتی ہے، اس کے ہم نشینوں میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔ اس کا وجود ایک ایسی تحریر ہے جس پر کئی لوگوں کے دستخط ثبت ہیں، اس کے سینہ میں کئی راز ہیں، بلکہ وہ خود ایک راز ہے، وہ کہا کرتی ہے عورت مرد کی کمزوری ضرور ہے لیکن مرد بھی عورت کی کمزوری ہے۔ اس کی رائے میں، جذبات کی شادی خودکشی پر منتج ہوتی ہے، عورت شادی سے پہلے روتی ہے، اور مرد شادی کے بعد، وہ طوائف کے حرم میں بیٹھ جانے کی چنداں قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے جس طوائف میں بیگم بننے کی ہمت نہیں، وہ ہرگز ہرگز بیوی نہ بنے۔ ایک طوائف کے لیے، جبکہ وہ بازار میں ایک عمر بتا چکے، گھر کا آنگن جیلخانہ ہے۔ جس طرح ایک گھریلو عورت طوائف کے ماحول کو سمجھنے سے معذور ہے اسی طرح ایک طوائف گھر کی فضا سے نابلد ہوتی ہے۔

اس کی باتیں بڑے ہی مزے کی ہوتی ہیں، وہ کہا کرتی ہے، عورت

مرد کو بزدل بناتی، شراب ذلیل کرتی، اور موسیقی سلاتی ہے، اُس کی نظر میں طوائفیں مد مکھیوں کا جھلڑ ہیں۔ ٹکیائیاں مویشیوں کا کھڑک ہیں۔ اور میراثی سہ پہر کی دھوپ کا تڑاقا ——————!

؟ ؟ ——— میاں! اب جوانوں کی رتی چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارا چراغ بڈھا ہو گیا۔ آپ ہفتوں سے آ جا رہے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے کہ فقیر کے دل میں بھی آپ کے لیے قدر پیدا ہو گئی ہے، ورنہ خوش پوشش لوگ جن پر دولت کا جھوٹا جھول چڑھا ہوتا ہے، ان مکانوں سے نکلتے ہیں تو ان کے لہجہ کی آب مر چکی ہوتی ہے، اور تانگہ میں بیٹھکر وہ جلی کٹی باتیں کرتے ہیں کہ ان کے حسب نسب کا اختر نجتر کھل جاتا ہے، بالخصوص نئی تانتی تو وہ نٹ کھٹی کی بات کرتی ہے کہ بسا اوقات طبیعت جھنجھلا جاتی ہے، جی چاہتا ہے ان سے کہیں، میاں آج کے بچھپے آج ہی جلا نہیں کرتے، لیکن ایک چپ میں بڑی خیر ہے ——— !

——— میری عمر اس وقت ساٹھ سے کچھ اوپر ہے، یوں سمجھئے کہ زندگی جھنجھو جھونٹوں میں نہیں بتائی ہے، لیکن جو کچھ آج نظر آ رہا ہے وہ کبھی نہیں تھا، اب تو لفندروں کی بادشاہت ہے، ہر کوئی ہتھیلی پہ سرسوں جماتا ہے، اور پھر یہ اس بازار ہی پہ موقوف نہیں، سارے شہر کی حیا مر چکی ہے، جہاں تہاں جھوٹ کے وارے نیارے ہیں، آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے، ہر کسی کا بہرہ کھلا ہوا ہے، جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں ———

——— بڈھے کی عادت تھی کہ وہ کبھی نہیں برتتا تھا۔ ہم ہر شب اس کے تانگہ میں سوار ہوتے، اور وہ ہمیں، ڈیڑھ روپے میں میکلوڈ روڈ تک چھوڑ

آتا تھا، لیکن آج جو قاضی نے چھیڑا، تو ایک دفتر کھل گیا، ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ وہ بڈھا جس کے ٹانگہ پر آپ سوار ہو کر جاتے ہیں، اس بازار کو پاتال تک جانتا ہے۔ اُس کی دولت یہیں لٹی ہے، کبھی وہ ایک متمول آدمی تھا، اس کی حویلیاں تھیں، لیکن اب تانگہ ہانکتا اور گذارا کرتا ہے۔

"بابا! ہم تو اس بازار کے حالات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور کئی دنوں سے اسی لیے چکر لگاتے ہیں۔"

بڈھے نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر دیکھا، اور پھر مسکراتی ہوئی آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا،

"جی ہاں! تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے۔"

معلوم ہوا، بڈھے کو مذاقِ سخن بھی ہے ——— اتفاق سے اس روز شہناز وغیرہ گھر میں نہیں تھیں، اور ہم بغیر ملے واپس آ رہے تھے، جب بڈھے کی یہ باتیں سنیں، تو ہم نے علامہ اقبالؒ کے مزار پر تانگہ رکوا لیا اور چاہا اس سے کچھ پوچھ گچھ لیں۔

"سنا ہے آپ نے بھی اس بازار میں بہت کچھ گنوایا ہے۔"

"میں نے!" ——— اس کا لہجہ قدرے توانا ہو گیا، ——— "جی نہیں! میں نے بہت کچھ کمایا ہے، اور پھر یہ آپ سے کس نے کہا؛ وہ الفن تو کٹ چکی ہے۔ ایک آدھ صورت گور کنارے لگی ہے، ان کی اولاد میں سے دو نو

بہنیں فلاں فلاں کے گھر میں ہیں۔

"تو گویا آپ نے ان مکانوں میں جوانی بسر کی ہے؟"

"اس قصّے کو چھوڑیئے۔ مجھے دیکھئے، میری زندگی عبرت کا مرقع ہے، آپ کا خون تازہ ہے، اسے ضائع نہ کیجئے۔ ان مکانوں سے کوئی سلامت نہیں گیا، ان تنکدوں میں ایمان کو دیمک چاٹ جاتی ہے۔ یہ عورتیں نہیں جونکیں ہیں، ان کے مرد بچھو ہیں، ہر کوئی سنپولیا بلکہ گھیٹا ہے، ان کی محبت روپیہ سے شروع ہوتی ہے اور روپیہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں وفا، صبر، شرافت، خلوص، وغیرہ نام کی کوئی شے نہیں، صرف جسم ہیں یا بستر، آپ ان سے ایک ہزار برس رسم و راہ رکھیں، اور گنج قارون بھی لٹا دیں، تو بھی یہ آپ کے دوست نہیں ہونگے، یہ انسانوں پر شیروں کی طرح دہاڑتے اور ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہیں، اور جب جیبیں کتر لیتے ہیں، تو ان کی عورتیں بلی کی طرح میاؤں کرتی اور مرد کتوں کی طرح بھونکتے ہیں۔"

لیکن ہم تو جیسا آپ سے کہا ہے محض معلومات جمع کرنے کے لیے آتے ہیں۔"

"—— معاف کیجیے ایک دفعہ کی چاٹ مدۃ العمر تک پیچھا نہیں چھوڑتی ہے۔ یہ رسم و راہ ہی جنجال ہو جاتی ہے۔ یہ نظر کی گمراہیاں انسان کے دل و دماغ کو ہلا دیتی ہیں، اور پھر نظر اس وقت تک نہیں نکلتی جب تک ہڈیاں

نچڑ نہیں جاتی ہیں"

"کیا آپ" ——؟

میری کہانی چھوڑیئے، یہ میرے تجربہ کا جوہر ہے جو آپ سے کہہ رہا ہوں"

"لیکن پھر بھی آپ ہمیں بہت کچھ دے سکتے ہیں، دیکھئے نا ہر کہانی میں بہت سے سبق ہوتے ہیں، جو انسان از خود حاصل کرتا ہے"

"میری کہانی عام انسانوں سے مختلف نہیں، سب کے ساتھ یکساں بیتتی ہے۔ میرے باپ دادا متمول لوگ تھے۔ کئی مربعے زمین تھی، کئی حویلیاں تھیں۔ میں ان کا اکلوتا بچہ تھا۔ جب والد کا انتقال ہو گیا، تو ایک لاکھ کے قریب نقد روپیہ تھا، میں اس وقت دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا، آپ جانتے ہیں امیروں کے بچے عموماً غبی ہوتے ہیں۔ میں بھی پڑھائی میں کچھ زیادہ ذہین نہ تھا۔ طبیعت کا رجحان کھیلوں کی طرف تھا والد کی موت نے طبیعت کا ہر بند توڑ ڈالا، ایک دن کچھ دوست ہنسی ہنسی میں گانا سننے کے لیے لے گئے، وہاں رفتہ رفتہ عشق کا پیچ لڑ گیا۔ اس کا بھی سن آغاز تھا، اور میرا بھی سن آغاز، پہلی سہاگ رات کے پندرہ ہزار روپے ادا کیے"

"سہاگ رات"؟

جی ہاں یہ ایک شریفانہ لفظ ہے، ورنہ ان کے ہاں کوئی سہاگ رات نہیں ہوتی، نہ باجا نہ گاجا، نہ مہندی، نہ ڈھولک، نہ براتی نہ دعوت ——— کچھ نہیں ——— صرف روپیہ ——— جسم ——— اور بستر"

جب نقد روپیہ ختم ہو گیا تو زمینیں گروی رکھی گئیں، وہ بھی بک گئیں پھر حویلیاں رہن رکھیں، آخر ان کا سودا بھی ہو گیا۔ اور جب سب کچھ دے چکا تو دیگ کی کھرچن کو بھی داؤں پر لگا دیا ——— مگر پانچ برس میں ملا کیا؟ ایک جسم جو ہمیشہ پرایا تھا، ہڈیوں میں نقاہت آ گئی۔ عزت قہقہوں میں بٹ گئی، کچھ دنوں تو ان کے ہاں پڑا رہا، وہ بھی اوپرا سا التفات برتتے رہے، لیکن وہ دن بھی آ گیا جب مجھے پان بنانے کے لئے کہا گیا، اور گلے بندھے جو پہلے جھک کے سلام کہتے تھے اب مسکرا کر گذرنے لگے۔ میراثی حقے کی نئے تک نہ چھوڑتے۔ اب اُس جسم کے کئی گاہک تھے۔ میں عشق کی بے بصری میں سب کچھ دیکھتا رہا، اور آخر ایک دن ایسا آ گیا، کہ میں ان کے ہاں اِکہ چلانے پر مامور تھا اور جو لوگ کبھی میرے لئے چلمیں بھرتے تھے، میں اُن کے حقے تازہ کرتا تھا اور یہ تانگہ چلانا میں نے انہی کے ہاں سیکھا ہے۔

بڈھے کی آواز رندھ گئی ——— قاضی نے سہارا دینے کے لئے کہا۔

"وہ اب کہاں ہے"

"وہ مر کھپ گئی ہے، اس کی ایک بہن نواب . . . . . کے ہاں ہے، دو بیٹیاں . . . . . کے گھروں میں ہیں۔ البتہ خلیری اور چچیری بہنوں کی اولاد اسی بازار میں بیٹھتی ہے"

"کیا وہ آپ کو پہچانتی ہیں؟"

"جی ہاں ان کے ذرہ ذرہ تک پہچانتے ہیں۔ آپ بازار میں چلے جائیے، وہ تمام بلڈنگیں، جو ان کے نام سے منسوب ہیں، اس فقیر ہی کے کھنڈر پر تیار ہوئی ہیں ہر کوئی جانتا ہے کہ ان عمارتوں کی نیو، محمد دین . . . . . کی دولت پر رکھی گئی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ محمد دین اسی بازار میں تانگہ چلاتا ہے"

"لیکن آپ نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟"

"سوال پیشہ کا نہیں، زندگی گذارنے کا ہے، میری کوئی اولاد نہیں، بیوی نہیں، رشتہ دار نہیں، اُس نے مجھ پر ترس کھایا، تانگہ دے دیا، میں چلاتا رہا، کماتا رہا، کھاتا رہا"

"یہ وہی تانگہ ہے؟"

"جی نہیں! یہ دوسرا تانگہ ہے لیکن ہے اُسی تانگہ کی کمائی کا"

"آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کی ناک کاٹ ڈالتے، لیکن یہ ذلت گوارا نہ کرتے ——"

بڈھے نے زور کا قہقہہ لگایا جیسے وہ یہ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

"میاں! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جو لوگ اس بازار میں آتے ہیں، ان کی غیرت آتے ہی مر جاتی ہے، اور جو چیز کچھ دن کے لیے طبیعت پر بوجھ بن کے رہتی ہے، وہ ضمیر کا کانٹا ہوتا ہے جس کو رفتہ رفتہ عیش کی آگ جھلسا دیتی ہے۔ اس وقت تو آپ مزار پہ بیٹھے ہیں، بازار میں ہوتے تو میں آپ کو دکھاتا کہ بیسیوں لوگ لٹ لٹا کر وہاں بیٹھے ہیں، کبھی تو گزنے کی قبر پہ ملیے، میں آپ کو بتاؤں گا کہ کون کس عمارت کی اینٹ ہے؟"

"تو ابھی چلیے۔"

ہمارے اصرار پر بڈھا مان گیا، تانگہ کو اڈے میں کھڑا کیا، ایک نعل گیر نوجوان سے کہا، ذرا خیال رکھنا، ابھی آتے ہیں،

ہوٹل میں چائے کی میز پر ہم پانچوں بیٹھ گئے۔ دوسری میز پر غالباً "استاد لوگ" بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بڈھے نے کہا، ان کی باتیں سنو، یہ اسی گٹم کے ذگ ہیں، ایک کہہ رہا تھا۔

"یہ سب محمد دین کی ہڈیاں ہیں جو ان مکانوں کی بنیاد میں پڑی ہیں، خدا جانے وہ مر گیا یا زندہ ہے۔ لیکن پچھلے دنوں کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ تانگہ چلاتا ہے، اب یہ خانزادہ جو چھپتا ہے، اس کے پاس تولے دے کے بیس پچیس ہزار روپیہ ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ روز کی مار ہے۔"

"یہ روپیہ کیونکر ہتھیاتی ہیں؟"

"یہی تو ان کا فن ہے۔ سب سے پہلے تماش بین کی حیثیت کا جائزہ لیتی ہیں، پھر اسی کے مطابق اپنی طلب و خواہش کا نقشہ بناتی ہیں۔ ایک گراں قدر رقم ماہانہ مقرر ہو جاتی ہے، پھر مجرا ہے، اُستاد جی ہیں، لگے بندھے ہیں، جُوا ہے، آپ بیٹھے ہیں، نوکر آتا ہے۔

"بی بی جی آج کیا پکے گا؟"

"مرغا، بٹیر، تنجن، بریانی ——— وغیرہ، اور آپ کی جیب خود بخود کھل جاتی ہے،

آپ نے کہا چلیے سیر کو چلتے ہیں، اُس نے تانگ پر اصرار کیا، ہر پھیرے میں کئی کئی ہزار اٹھ جاتا ہے۔ ان کے ہاں کپڑے کے کئی کئی سو جوڑے ہوتے ہیں، اور زیور کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں رات کا عشق بڑا مہنگا ہوتا ہے، لیکن دن کا عشق، کبھی گراں —! کبھی ارزاں ———!!

!! ——— وہ دیکھیے چوبارے پر ایک نائکہ بیٹھی ہے، بڑی مالدار اسامی ہے، اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اِدھر اُدھر سے ایک لڑکی خرید کر جوان کی ہے، اور اب اس کے سہارے جی رہی ہے، اس کی بوٹی بوٹی میں حرام رچا ہوا ہے۔ اُدھر کھپراج منزل کی سج دھج ملاحظہ کیجیے۔ اس کی مالکن خانہ نشین

ہوگئی ہے، لیکن ہے پکا پان، آج نہ مری کل مری۔ وہ سامنے ہجرو گجر کا مکان ہے، غور فرمائیے، بلڈنگ کا ناک نقشہ کیا ہے؟ اور وسط میں کتبہ لگا ہوا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکان حاجی چودھری ہجرو

اور اندر کیا ہوتا ہے ——؟ اسی قطار میں دیکھیے پیچھے اوپر بازاریوں کے مکان ہیں، کیا بن سنور کر بیٹھی ہیں، اور وہ مسجد، ان مکانوں میں ایک مریل دوشیزہ کی طرح دبکی بیٹھی ہے۔ یہ ڈپٹی جی کا مکان ایک بڑا مذبح ہے، اور یہ سامنے کئی کوٹھی خانے ہیں، ہر بڑی عمارت پر سنگ مرمر میں بحروفِ جلی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کھدا ہوا ہے، یا تو ان کے مالکوں کا اسلام مر چکا ہے یا اللہ میاں ڈھیل دے رہے ہیں"

"یہ ملا لوگ جو ہر لحظہ اسلام خطرہ میں کا ڈھول پیٹتے ہیں، وہ بھی تو آیاتِ الٰہی کی اس اہانت پر نہیں بولتے" —— قاضی نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹکر گدا ہیں، میں انہیں شرعی کنجن کہتا ہوں۔ بڈھے نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں یہ دیکھئے۔ وہ نوجوانوں کا غول سا ہے، سب ان کے بھائی بند ہیں، ہر کوئی دماغ چوٹا ہے۔ یہ تمام بچے ایسے بُرے اٹھے ہیں کہ ان میں

کوئی بھی خود کماؤ نہیں ہے، سب بہنوں یا ماؤں کے صدقے میں دندناتے پھرتے ہیں، ان کی آنکھوں میں روشنی ہے، لیکن غیرت کی دنیا میں اندھیر ہے۔

اُدھر موڑ کی کھٹیا پر ایک کھوسٹ میٹھا ہے وہ بازار کا چودھری ہے، لیکن اس کا بانا غائب ہے، اور اب "تانا ہی" تانا رہ گیا ہے!

چیت رام روڈ کی بازاریاں، اس ڈھائی ڈھوٹی کے مینہ کی پیداوار ہیں کنچنوں کے ہاں خمیری روٹی پکتی ہے لیکن ان کے ہاں بے خمیر پکاتے ہیں، ان کا کاروبار کچھ "لو اور کچھ دو" تک محدود ہے۔ اور یہ جو گہما گہمی نظر آتی ہے ان میں کچھ کن رسیے ہیں، اور زیادہ تر نظر باز، جو اپنی جنسی تندرستی کے لیے آجاتے ہیں! ——

—— بڑے بڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجی ہے جب کہیں ان عماروں کی اینٹیں جھڑی ہیں۔ ہر حویلی میں کئی خاندانوں کی اینٹیں ہیں، خون ہے، گارا ہے —— لیکن اب جو طوائفیں ہیں وہ خیاسے ہیں، اور جو گویا ہیں وہ الشاذ کالمعدوم ہیں، میراثی ہیں تو وہ منچوں منچوں کرتے ہیں۔

"لیکن بابا! کچھ تو اچھی گویا ہیں!"

"مثلاً"

"مثلاً مختار حشر والی!"

"اس کا تلفظ غلط ہے!"

"شمشاد"

"گابیتی ہے، لیکن اب اس کا زمانہ بیت گیا ہے"

"فریدہ"

"وہ گاتی نہیں رانبھتی ہے"

"الماس"

"کبھی کوکتی اور کبھی ممیاتی ہے"

"اختری"

"وہ تو غٹرغوں کرتی ہے"

"انور بائی"

"لاحول ولاقوۃ، وہ تو منہناتی ہے، یا بھن بھناتی ہے"

"زرینہ"

"کڑکڑاتی ہے"

"الہٰی جان"

"چوں چوں کرتی ہے"

"زہرہ ومشتری"

"کائیں کائیں کرتی ہیں"

"عنایت بائی"

"بلبلاتی ہے"

"شمیم"

"جھنگارتی ہے"

"گلشن آرا"

"چنگھاڑتی ہے"

"اس کی بہن شمشاد"

"چٹ چٹاتی ہے"

"اور زاہدہ پروین ——؟

طوائف تو نہیں، پیرنی ہے، بس گالیتی ہے"

"شہناز"

"مورنی ہے، اچھا ناچتی ہے"

"تو گویا آپ اس بازار کی جڑیں تک جانتے ہیں"

"جی نہیں! ان کی جڑ تو خاکم بدہن ان کا پروردگار بھی نہیں جانتا ہے، یہ آپ کو جتنی صورتیں بھی نظر آتی ہیں، سب جھوٹے زیور ہیں۔

اور یہ پہناوے، اودے، ہرے، نیلے، پیلے، کالے سفید، چمپئی، جامنی، دھانی، شنگرفی، فالسائی نارنجی، لاجوردی، زنگاری، سردئی پیازی، گلابی

یا ککربزی ـــــــ جو آپ کو دریچوں میں اُڑتے نظر آتے ہیں، یہ سب، ہماری اور آپ کی جوانی کا کفن ہیں، ـــــــ؟

؟ ـــــــ" اور یہ بعض تانگے والے بھی تو حرّاف ہوتے ہیں"۔

"جی ہاں حرّاف کیا! اس سے بھی کئی قدم بڑھکر ہیں" کچھ تو انہی میں سے ہیں، کچھ باقاعدہ دلاّلی کماتے ہیں، کچھ اس تماشش کے ہیں کہ ان پر ایک پنتھ دو کاج" کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ یعنی خود پیشہ ور ہیں، کوٹھی خانہ کھول رکھا ہے۔ دو چار لڑکیاں ہیں، خود گاہک لاتے اور دولت پیدا کرتے ہیں"۔

"ایسے کتنے ہونگے"؟

"میرے پاس کوئی رجسٹر تو ہے نہیں، اور نہ میں نے کبھی گنتی کی ہے۔ لیکن دو اڑھائی سو سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں، ان کی بڑے بڑوں تک رسائی ہے، یہ ایک کمپنی کی طرح کام کرتے ہیں، کچھ تو اس چوک میں رہتے ہیں، کچھ میکلوڈ روڈ میں مسلم لیگ کے دفتر سے متصلہ میدان میں، کچھ قلعہ گوجر سنگھ کے اڈوس پڑوس، کچھ میٹرو ہوٹل کے باہر، اور کچھ الفنسٹن ہوٹل کے پہلو میں، اس کے علاوہ مزنگ، اچھرہ، مسلم ٹاؤن اور گاف روڈ پر بھی ان کی دو کانداریاں ہیں۔ انہیں ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں گناہ چہرے سے بول اُٹھتا ہے اور خواہش آنکھوں میں جھلک اٹھتی ہے،

ان کے علاوہ باقاعدہ ایجنٹ بھی اِدھر اُدھر بکھرے رہتے ہیں۔"

"اور یہ جو لوگ یہاں آتے ہیں؟"

"ہر چہ ر بازار کہ یہاں آتا ہے۔"

"اور یہ عورتیں؟"

"جو کچھ رات کو کماتی ہیں، دن کو کھا پی جاتی ہیں، بعض کے نکھٹو شوہر ہوتے ہیں، وہ ان کے لیے سودا سلف لاتے ہیں، بعض محبت بھی کرتی ہیں، لیکن گاہکوں سے نہیں اوباشوں سے، جو کچھ رات کو متھیاتی ہیں دن کو انہیں کھلا پلا دیتی ہیں، اکثر غنڈے انہی کی کمائی پر اینڈتے پھرتے ہیں۔ اگر وہ ان غنڈوں کو کھلائیں پلائیں نہیں یا انہیں ہاتھ میں نہ رکھیں، تو یہ لوگ اکٹھے ہو کر ایسی دھما چوکڑی مچائیں کہ کوئی بتی بھی روشن نہ رہ سکے۔"

"تو گویا ان کی زندگی غنڈوں کے ہاتھ میں ہے؟"

"جی ہاں نوّے فی صد کی زندگی غنڈوں کے ہاتھ میں ہے، زندگی ہی نہیں کمائی بھی، میرا اندازہ ہے، ان بازاریوں کا نوّے فی صد روپیہ لنگاڑے کھا جاتے ہیں، جو نشہ کہیں دستیاب نہیں ہوتا وہ یہاں ملتا ہے، شہر میں شراب بند ہے لیکن یہاں وافر ہے۔ کئی چوباروں میں افیون، چرس، چانڈو، کوکین کی تجارت ہوتی ہے ——"

"بابا، کبھی جوانی بھی یاد آتی ہے؟"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا

"جی ہاں! جوانی مجھے ہی نہیں سب کو یاد آتی ہے۔ لیکن انسان ماضی پر تاسوے ضرور بہاتا ہے، اس سے سیکھتا کچھ نہیں، آدمی نے کبھی دوسروں کے تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا، وہ ہمیشہ خود تجربہ کرتا ہے، ہم کرتے ہیں غلطیاں، اور نام رکھتے ہیں تجربہ کس قدر افسوسناک بات ہے، کہ زندگی کے سبق ہمیں اس وقت ملتے ہیں، جب وہ ہمارے لیے بیکار ہو جاتے ہیں —— یاد رکھو دنیا کے بدترین کام ہمیشہ بہترین نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں ——!!

• • •

محمد شریف (یہ لوگ ہمیشہ اپنا صحیح نام چھپاتے ہیں) یہ ایک گٹھیلا نوجوان ہے، وجیہہ ہے، عمر بھی کچھ زیادہ نہیں، یہی کوئی بیس بائیس برس کے پیٹے میں ہے، خوش پوشاک ہے، ڈینٹل ہسپتال سے اس طرف، فریدہ کے مکان کے نکڑ پر سات آٹھ نوجوانوں کی ایک منڈلی کھڑی ہوتی ہے، سب حراف ہیں، اور یہ اُن کا سرخیل ہے، بڑا خوش اخلاق ہے۔ شہری پنجابی اور گلابی اُردو خوب بولتا ہے، میں نے اُسے اس پیشہ پر کئی دفعہ ٹوکا —— لیکن پہلے تو وہ عام عذر کرتا رہا —— بیکاری ہے، پیٹ پالنا ہے، چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں، باپ مرچکا ہے، ماں بوڑھی ہے، پھر ایک اور شخص

سے پتہ چلا کہ اچھے گھرانے کا نوجوان ہے، پہلے گھر کی پونجی پر ہاتھ صاف کیا، اور عیاشی کرتا رہا، جب بڑے بھائی نے فارغ خطی دے دی تو اپنی "محبوبہ" کے ہاں رہنے لگا، کچھ دنوں اُس کی دلالی کرتا رہا، لیکن اب تقریباً تمام کوٹھی خانوں کا گماشتہ ہے، اس قلبِ ماہیت نے اس کے خیالات پلٹ ڈالے ہیں، وہ گناہ کے تصور کو محض گفتگو کی چیز سمجھتا ہے، اُس کا خیال ہے جو چیز چوری چھپے کی جاتی ہے، وہ گناہ ہے، ورنہ اس کے علاوہ گناہ کا تصور محض اضافی ہے، ——— شریف کا کہنا ہے: "جو لوگ یہاں آتے ہیں ان کی صورتیں زمانے کے لیے ضرور خوف یا تقدس پیدا کرتی ہیں لیکن ہمارے لیے نہیں، اس حمام میں بڑے بڑے لوگ ننگے ہیں، آپ تصور نہیں کر سکتے کہ کون آتا اور کون جاتا ہے، جب رات کے گیارہ بجتے ہیں تو شاہی مسجد کی سیڑھیوں سے ملحق سڑک پر، رنگ برنگ کی کاریں آتی، اور یہاں لے کر اڑ جاتی ہیں۔

جو لوگ یہاں ٹھیرنا نہیں چاہتے، وہ کوٹھیوں میں چلے جاتے ہیں بعض ہوٹلوں میں لے جاتے ہیں، بعض سیر و تفریح ہی میں خوش وقت ہو لیتے ہیں، بعض دریا کا کنارہ ڈھونڈتے اور بعض شہر کی طرف نکل جاتے ہیں، کئی شیخوپورہ یا لائل پور کی سڑک پر دس بارہ میل تک چلے جاتے، اور پھر کار روک کر، ڈرائیور کو مصنوعی خرابی میں لگا دیتے اور خود اصلی خرابی میں لگ

جاتے ہیں "

ایک بڑے آدمی کے متعلق اُس نے بتایا، کہ وہ فلاں لڑکی کو اپنے مکان میں لے جانا چاہتا تھا۔ طے پایا کہ میں اور وہ لڑکی شاہدرہ اسٹیشن سے سوار ہوں، اسی غرض سے مجھے سوٹ سلا دیا گیا۔ لاہور اسٹیشن پر ان صاحب کا ڈرائیور موجود تھا، ہم کار میں کوٹھی پہنچے، بیگم نے خیر مقدم کیا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ اُن کے دوست کی بیگم، اور اُس کا بھائی کراچی جانے کے لیے آرہے ہیں، ایک شب لاہور میں قیام کریں گے، سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ ہمارے لئے مہمان خانے میں الگ بستر کر دیا گیا تھا، جب نصف رات گذر گئی تو وہ صاحب دبے پاؤں اندر تشریف لائے، میں بستر چھوڑ کر باہر نکل گیا، منہ اندھیرے لوٹا اور دن چڑھے تک بیٹھا رہا، پھر ناشتہ کیا اجازت چاہی، ڈرائیور اسٹیشن پر چھوڑ گیا، ہم نے تانگہ کیا اور گھر آ گئے ——— !

" آپ ہی کہئے گناہ کیا ہے اور ثواب کیا نہیں؟ چوری کرنا جرم نہیں پکڑے جانا جرم ہے۔ سب لوگ گناہ کرتے ہیں۔ کوئی چھپ کے کرتا ہے، کوئی کھلم کھلا، کچھ اخلاقی یا قانونی دیواریں ہیں جو درمیان میں چن دی گئی ہیں، جو لوگ ان دیواروں کو پھاند جاتے ہیں، ان کا گناہ گرفت سے باہر ہو جاتا ہے، جو ان دیواروں پر پکڑے رہتے ہیں، وہ گناہ و ثواب کی

گرفت میں رہتے ہیں، اور جو ان دیواروں سے اس طرف ہوں، وہ بے قید ہوتے ہیں"

"تمہیں کیا ملتا ہے؟"

"صرف گذر اوقات ہو جاتی ہے، اور کیا ملے گا؟ اس پیشہ میں کوئی عزت تو ہے نہیں"

"عجیب بات ہے، تم لوگ، ذلت کا اقرار بھی کرتے ہو، اور پھر اسی کو اختیار کئے ہوئے ہو!"

"جی ہاں، لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں، ایک تو سوسائٹی ایسی ہے، دوسرے جب ہڈیوں میں حرام سرایت کر جاتا ہے، تو غیرت یا احساس غیرت ختم ہو جاتے ہیں ـــــــ کوئی جی دار ہو، تو پانچ دس روپے دے جاتا ہے ورنہ ان عورتوں سے دس فی صد کمیشن بمشکل تمام ملتی ہے۔ اب لوگوں کے پاس پیسہ نہیں رہا۔ ورنہ مشتاقوں کی قطاریں بندھی رہتی ہیں۔ اب کوئی اکا دکا آنکلتا ہے، یا بعض لوگ رشوت یا سفارش کے لیے لے جاتے ہیں"

"کیا آپ لوگ خدا کے غضب کو قریب نہیں لا رہے؟"

"جی ہاں، خدا کا نام تو چاروں طرف بکھری ہوئی مسجدوں میں روز گونجتا ہے، لیکن خدا کا غضب کہیں نظر نہیں آتا، وہ دیکھئے عالمگیری مسجد کھڑی ہے، اُس کا گنبد بھی کھڑا ہے، اُس کے مینار بھی کھڑے ہیں، کبھی ان کی اینٹوں کو جنبش نہیں ہوئی، وہ سامنے قلعہ والیوں کی بلڈنگ ہے، لوح پر لکھا ہے:۔

"ھٰذا من فضل ربّی"

ادھر شہباز خاں میں نوگزے کی قبر ہے، راویوں کا بیان ہے، بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے وہ بھی چپ چاپ پڑے ہیں۔ وہ ٹکیائیوں کی گلی میں حضرت قاسم شاہ کی خانقاہ ہے، ان کی تربت بھی صبح قیامت کے انتظار میں چپ ہے، یہ ہفتہ وہ ہفتہ میں محرم آرہا ہے، دسوں دن کاروبار بند رہتا ہے، سب حسین کی نیاز دیتی، علم نکالتی، اور مختلف ٹکڑیوں میں عزاداری کی مجلس رچاتی ہیں، ایک ایک کی زبان پر اہلِ بیت کے نام ہوتے ہیں، یہ چھاتی پیٹتی ہیں، ذاکروں کی ہچکی بندھتی ہے اور لوگ روتے ہیں، کوئی مسلمان شارع عام پر انہیں پاک بیبیوں کے نام لینے سے نہیں روکتا۔ لیکن کسی مسلمان کی بہو بیٹی کا نام بازار میں لو، تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے، آپ کس کس زخم پر پھاہا رکھیں گے، تمام بدن میں ناسور ہیں"

!—— "شریف خدا لگتی کہنا، اِن عورتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"

"یہ آج کل کے "شرفا" سے اچھی ہیں"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ جیسی بھی ہیں ظاہر ہیں، لیکن "شرفا" کی آبرو تو کتابوں کی اوٹ میں جسمانی عیاشی ڈھونڈھتی پھرتی ہے، اور پھر، بابو جی، —— شریف کی

آواز میں قدرے گونج پیدا ہو گئی ـــــــــ قدرت کبھی اپنا انتقام نہیں چھوڑتی، انہی لوگوں کی بیٹیاں کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوتی ہیں، جو دوسروں کی آبرو پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، اس کی لاٹھی بے آواز ہے ـــــــ!

ـــــــ "یہ ٹھیک ہے لیکن ان بازاریوں کے متعلق تمہارا صحیح خیال کیا ہے؟"

"میرا خیال کیا ہوگا، ظاہر ہے کہ انہیں عورتیں کہنا نسائیت کی توہین ہے، صحیح عورت تو ڈولی میں نکلتی اور کفن میں جاتی ہے، وہ ماں کی کوکھ سے قبر کی گود تک ایک ستر ہوتی ہے۔

• • •

قمری نے سعیدہ کے مکان پر ایک عمر بتا دی ہے۔ اس وقت اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہے، سعیدہ کی ماں کے عہد میں اُس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا، اور اب بیٹی کا زمانہ بھی گذار رہا ہے، قد لانبا ہے، داڑھی صفاچٹ، مونچھیں خطِ استوا کو جاتی ہیں، رنگ کا کریزی ہے، دانتوں میں کھڑکیاں ہیں چہرہ سیاہی مائل ہے۔

اس بازار میں ایک طبلچی بھی اس کا ہم عمر نہیں، جو کچھ کمایا، اس سے ایک دو مکان خرید کئے ہیں، خود شرفاء کے محلے میں رہتا ہے۔ خانا دو بچے ہیں، اور دونوں پڑھتے ہیں، ایک کالج میں ہے، ایک اسکول میں اس کو طبلے کی

جوڑی سے وہی عشق ہے، جو ایک شہسوار کو گھوڑی سے ہوتا ہے، یا ایک سپاہی کو تلوار سے، یا کسی فن کار کو قلم سے، وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا، اُس کا کہنا ہے، اب طبلچی تو اٹھ گئے ہیں، ان کی جگہ "مشلچی" آگئے ہیں، اور مشلچی اُس کی اصطلاح میں حرّاف کے معنے ہے۔ وہ ایک فنی طبلچی کو آرٹسٹ سمجھتا ہے، جہاں مغنی کی آواز لڑکھڑاتی ہے وہاں طبلچی سہارا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک طبلے کی آواز نہ صرف گویّوں کے عیب کی پردہ پوش ہے، بلکہ ان کی نے کو سرآتشہ کرتی ہے، وہ طبلے کو موسیقی کے ایک اہم ساز سے تعبیر کرتا ہے، اس کے نزدیک ہندوستانی یا پاکستانی سنگیت طبلہ کے بغیر ایک عاری نظم ہے، وہ فخر سے کہا کرتا ہے کہ طبلہ مسلمانوں کی ایجاد ہے، امیر خسرو ستار کے موجد تھے، ابن سینا نے شہنائی ایجاد کی ہے۔ ابو نصر فارابی "قانون" کے مخترع تھے، سیف الدولہ فرمانروائے شام نے ابو نصر کے لئے اپنے دربارِ خاص میں اربابِ نشاط کو بلوایا، ہر کسی نے اپنے اپنے کمال کا اظہار کیا، لیکن ابو نصر نے سب کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا، نتیجہ یہ ہُوا کہ بڑے بڑے آہو چوکڑی بھول گئے۔

سیف الدولہ نے ابو نصر سے دریافت کیا:۔

"آپ بھی اس فن کو جانتے ہیں؟"

ابو نصر نے جواب دیا،

"جی ہاں جانتا ہوں۔"

سیف الدولہ نے اصرار کیا، کچھ سنائیے۔ ابونصر نے ایک تھیلی سے لکڑی کے چند ٹکڑے نکالے، انہیں ایک خاص ترتیب و ترکیب سے جوڑا، ان پر تار کھینچے اور انہیں بجا بجا کے ایک ایسی دھن میں گانا شروع کیا کہ جو سنتا، مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ ابونصر نے اس ساز کو کھول کے نئی ترکیب سے جوڑا اور سُر ملا کے گانا شروع کیا۔ اب لوگ زار و قطار رو رہے تھے، پھر ساز کو کھول ڈالا، ایک نئے ڈھنگ سے جوڑا، اور بجانا شروع کیا اب سامعین پر غنودگی کا عالم تھا، سیف الدولہ سمیت سبھی سو گئے، ابونصر نے ساز کھولا، تھیلی میں رکھا، اور وہاں سے چلا گیا ——— !

ب ——— "وہ باکمال تو اٹھ گئے ہیں، لیکن اُن کی کھرچن باقی ہے، اور یار لوگ اسے بھی چاٹ رہے ہیں۔"

"کچھ گنے چنے لوگ تو ہونگے"

"جی ہاں اس بھرے سنسار میں، کوئی فن مرتا تو نہیں لیکن گھٹتا ضرور ہے کبھی تالی پیٹنا بھی ایک فن تھا، اب طبلہ بجانا بھی فن نہیں، ڈھونڈی نہ پیٹی طبلہ پیٹ لیا، وہ دیکھئے سامنے بیٹھک میں اکہرے بدن کا مچھو کرا طبلہ پیٹ رہا ہے کہ نقارہ پر چوب دے رہا ہے، کبھی طوائفیں استاد سمجھتی تھیں اب مذاق اڑاتی ہیں۔

القصہ جیسی روح ویسے فرشتے، نہ انہیں بجانا آتا ہے، نہ وہ گانا جانتی ہیں، اب فن کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، اُدھر قدردان اُٹھتے جا رہے ہیں، اِدھر فن مٹتا جا رہا ہے، اب طبلہ نہیں بجتا، بندر گھگھیاتا ہے۔

"آپ لوگ تنخواہ پاتے ہیں؟"

"جی نہیں، جو کمائی گانے میں ہوتی ہے، اس کا نصف بائی جی لیتی ہیں اور نصف سازندے، ——— طبلچی، سارنگیا، اور بارمونیم ماسٹر"

"روزانہ آمدنی کیا ہو گی؟"

"یہ تو گاہکوں پر منحصر ہے، جیسا چہرہ ویسے گاہک، جیسی آواز ویسی آمدنی، وہ پہلے سے حالات تو رہے نہیں، زمانہ ہی تہی دست ہو رہا ہے، کبھی سازندوں میں سے فی کس پانچ چھ سو روپیہ ماہوار کما لیتا تھا، لیکن آج بھی دو اڑھائی سو مل ہی جاتا ہے، لیکن اس کا انحصار، مختلف گھروں کی ساکھ اور شہرت پر ہے، بعض اُلّو کی دم فاختہ ہوتی ہیں اور اُن کے سازندے بھی بچھیا کے باوا، اکثر فاقوں مرتی ہیں اور ان کے کواڑ لگاتار، کئی کئی دن کھلے رہتے ہیں، بعض دودھیل گائے ہیں اور ان کی لاتیں بھی سہہ لی جاتی ہیں، جہاں تک میراثیوں کا تعلق ہے، ان میں کانوں کا سچا کوئی کوئی ہے، یا تو پھکڑ ہیں، یا حاضر جواب، یا طناز، یا ضلع جگت میں مشاق! ان میں چٹکی لینے کا ہنر نسلاً بعد نسل چلا آتا ہے، اور مُنہ آئی بات بے کھٹکے کہہ ڈالتے ہیں، بعض گپ مارنے

میں آندھی ہیں، رہا ٹنڈیوں کا سوال تو یہ درزی کی سوئی ہیں، کبھی گاڑھے کبھی کمخواب میں!

"اور جو لوگ یہاں آتے ہیں؟"

"ظاہر ہے کہ ان ٹہنیوں پر بھانت بھانت کے پرند چہچہاتے اور اڑ جاتے ہیں، ان آنکھوں نے ہزاروں قافلے لٹتے دیکھے ہیں، سینکڑوں خیموں کی رسیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ بیسیوں سنگھاسن ڈول گئے ہیں، لوگ بگولے کی طرح اٹھتے آندھی کی طرح چھا جاتے اور غبار کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، ایک ولولہ لے کر آتے ہیں، ایک حسرت لے کر چلے جاتے ہیں۔ جن میں غیرت ہوتی ہے، وہ دولت لٹا کر عزت بچا لے جاتے ہیں، جن کی غیرت مر چکی ہوتی ہے، وہ دولت کے بعد عزت کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بیسوا اور ہوا دونوں کا رُخ بدلتا رہتا ہے،

"لیکن جو لوگوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں؟"

"کچھ تو واقعی گھروں میں بیٹھ جاتی ہیں، اور ایسی کئی مثالیں ہیں۔ لیکن بیشتر لوٹ آتی ہیں، ان کے لئے گھر کی زندگی، قید کی زندگی ہے، جن عورتوں نے فی الحقیقت گھر کی زندگی قبول کر لی ہے، اُن کا دامن اب سورج کی طرح اُجلا ہے، ان کی اولاد بھی نکو نام ہے، البتہ اُن کا ماضی، کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا جب بھی گھریلو عورتیں اکٹھی بیٹھتی ہیں، ضرور کھسر پھسر کرتی ہیں، اور مرد بھی جب کہیں اکٹھے ہوتے ہیں یہ ضرور کہتے ہیں کہ فلاں کے گھر میں طوائف

ادب سے بیتی ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ خود موراں کے مکان واقع چوک متی یا چوک چکلہ میں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ہر جمعرات کو موراں ہاتھی پر سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر سلام کے لئے حاضر ہوتی۔ اُس نے چوک متی میں ایک مسجد بنوائی جو اب بھی موجود ہے اور مائی موراں کی مسجد کہلاتی ہے۔

کیا[1] فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین بیچ اس مسئلہ کے . . . . . . ؟ ؟ . . .

ایک دن بعض سرداروں نے مہاراجہ کے کان میں یہ بات پھونکی کہ موراں آپ کی وفادار نہیں، وہ صرف دھن کی دوست ہے، اور آپ خواہ مخواہ اس پر خزانہ لٹا رہے ہیں، اگر وہ واقعی آپ کی وفادار ہے تو اس سے کہیے کہ وہ آپ کے ساتھ جھٹکا کھائے، مہاراجہ نے موراں کو طلب کیا اور پوچھا "تم جھٹکا نہیں کھاتی ہو؟" اس نے کہا، "مہاراج بالکل نہیں"! حکم ہوا "آج کھانا پڑے گا" عرض کیا ــــــ "مہاراج! میں نے آپ کی "ملازمت" کی ہے، مذہب نہیں بیچا ہے"۔

---

[1] "متو" نام کی ایک طوائف کی بنائی ہوئی مسجد کلکتہ میں بھی ہے۔ ایک شاعر نے اس کا مادہ تاریخ نکالا ہے ؎

زکسب خاص متو ساخت مسجد | بجز اشں دخول خاص و عام است
قلم برداشتم چوں بہرِ تاریخ | ندا آمد کہ ایں بیت الحرام است

رنجیت سنگھ کو تاؤ آگیا۔ تمام جائداد کی ضبطی کے احکام صادر کئے، ایس پھر گیا تھا، جو کچھ منقولہ و غیر منقولہ تھا، سورماؤں نے قبضہ میں لے لیا، موراں ہفتوں پریشان رہی۔ اسی دوران میں اس کی ایک درویش سے ملاقات ہو گئی، اُس نے دعا کی، اور مہاراج دوبارہ مہربان ہو گئے۔ موراں حضرت گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار سے گھر واپس آتی تو گاڑیوں میں سامان لدا آرہا تھا، اور مہاراج بنفس نفیس تشریف فرما تھے۔ وزیر کا کہنا ہے کہ موراں سے دوسری پشت میں ہم لوگ امرتسر چلے گئے، اور تقسیم تک وہیں مقیم رہے۔ جو کچھ کمایا وہ اپنے تلکوں کی بھینٹ ہوگیا، اس کے علاوہ امرتسر میں کئی سو ایکڑ زمین تھی۔ دو چار کوٹھیاں بھی تھیں وہ بٹوارہ میں چھٹ گئیں۔

وزیر کی بیٹی ممتاز نے اپنے شباب میں مہاراجہ اندور کو مسحور کر رکھا تھا۔ مہاراج نے گانے کے لئے طلب کیا، اور پھر وہیں محصور کر دیا، ایک آدھ سال یورپ کے مختلف ملکوں میں ساتھ لئے لئے پھرے، بکنگھم پیلس میں ملکہ کے ساتھ لنچ کھایا۔ کسی طرح افشا ہو گیا کہ ممتاز رانی نہیں داشتہ ہے، اس پر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سرزنش کی۔

ممتاز کا دل ریاستی فضا سے اُکتا چکا تھا۔ اس کے ماں باپ امرتسر میں تھے مہاراجہ ملنے نہیں دیتا تھا، ایک روز مہاراجہ اور ممتاز موٹر میں جا رہے تھے کہ دہلی کے اسٹیشن پر ممتاز نے شور مچا دیا، سب نقشہ پہلے سے تیار تھا۔ پولیس نے

معاونت کی، اور ممتاز والدین کے ہمراہ امرتسر آگئی، وہاں سے بمبئی کا رُخ کیا، جہاں ممتاز نے ایک لکھپتی تاجر باولے سے عقد کا فیصلہ کر لیا، مہاراجہ کے نوکر چاکر تعاقب میں تھے انہوں نے موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر ڈالا، اور ممتاز کو گرفت میں لے کر بھاگنا چاہا لیکن دو انگریز فوجی افسروں کی اچانک آمد سے ملزم موقع پر پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ قائد اعظم باولے کے پیروکار تھے۔ قاتلوں کو پھانسی ہو گئی اور مہاراجہ کو گدی چھوڑنی پڑی ——!

——! اس وقت ملک کے عام اخباروں میں مقدمے کا چرچا رہا لیکن آج وہی ممتاز —— جس نے بکنگھم پیلیس میں بادشاہ اور ملکہ کے ساتھ شرف تناول حاصل کیا تھا ٹکسالی کے اندر ایک خستہ حال چوبارے میں زندگی گذار رہی ہے۔ ایک بیٹی ٹکیائی ہے جس کی آمدنی سے کنبہ پلتا ہے۔

وزیرہ، رجواڑوں کی زندگی کے اور چھور کو جانتی ہے۔ اس نے نسلاً بعد نسل نوابوں اور رجواڑوں کی چھاتی پر مونگ دلے ہیں، اُس کا بیان ہے کہ ریاستی فرمانروا اغلبتہً عیاش ہوتے ہیں، ان کے ہاں صرف تین شخصوں کو دخل ہوتا ہے، **حکما**، جو ان کے لئے کیمیائے عشرت تیار کرتے ہیں۔ **حراف** جو ان کے لئے لڑکیاں فراہم کرتے ہیں، اور **طوائفیں**، جو ان کے حواس پر قابو پاتی ہیں۔

ان فرمانرواؤں کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ اُس نے بتایا کہ ان کی غذائیں خاص قسم کے مرکبات سے تیار کی جاتی ہیں، ایک عام آدمی انہیں

ہضم کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا، مہاراجہ اندور صبح کے وقت جو ناشتہ کیا کرتے تھے، اُس پر دو سو روپے خرچ ہوتے تھے، اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں جنہیں انکے خوشہ چین ظل اللہ کہتے نہ تھکتے تھے، اپنے حرم میں بہت سی بیویاں رکھتے تھے ان کے بے شمار بچے تھے، جب کوئی مرجاتا، تو اسے "اندرون خانہ" ہی شاہی قبرستان تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک بڑی ریاست کے وزیر اعظم جن پر مہارانی لٹو تھیں، اور بعض روائتوں کے مطابق ریاست کا ولی عہد انہی کے صلب سے ہے، خود ایک مشہور طوائف پر جی جان سے فدا تھے، اس طوائف کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جب لڑکی جوان ہو گئی، تو اس کی ماں کسی بات پر ناراض ہو کر لاہور آگئی اور لڑکی کو بازار میں بٹھانا چاہا، وزیر اعظم نے سنا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اس کا کوئی قانونی حق تو تھا نہیں، صرف ایک نام تھا۔ کسی نہ کسی طرح طوائف کو دوبارہ راضی کر لیا، وہ ریاست میں چلی گئی، ایک رات جب سب سو رہے تھے، ایک خدمت گزار نے کئی ہزار روپے معاوضہ لیکر اس لڑکی پر پٹرول کا ڈبہ الٹ دیا۔ اور آگ لگا دی، جس سے وہ لڑکی ایک مقفل کمرے میں بھسم ہو گئی اور اس طرح وزیر اعظم کے دل کا یہ کانٹا نکل گیا کہ اُس کے صلب کی یادگار بھی طوائف بن سکتی ہے؟

ایک اور طوائف، جو اب ایک بڑے متمول ——— کی منکوحہ ہے

مہاراجہ کے دربار کی خاص گویا تھی، اس کو پہاڑی گیت گانے میں خصوصی ملکہ تھا۔ ریذیڈنٹ نے اُس سے مہاراجہ کو زہر دلوانے کی سازش کی، اُس نے شراب میں زہر ملا دیا، اُدھر مہاراجہ کو قبل از وقت معلوم ہو چکا تھا، وہ ریذیڈنٹ کے سامنے بے بس تھا۔ طوائف کو مروایا نہیں لیکن اُس کی تمام جائداد ضبط کر لی، اور ریاست بدر کر دیا۔

وزیر کا کہنا ہے کہ تمام ریاستیں (الا ماشاء اللہ) با اختیار چکلے ہیں، جو کچھ ان ریاستوں میں ہوتا ہے وہ چکلے میں نہیں ہوتا۔ آج بھی اس ملک میں، بڑے بڑے نواب، اور بڑے زمیندار، اور اس ملک کے باہر خداداد سلطنتوں کے بادشاہ، عورت کو شراب کے پیگ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ۔۔۔ ان کے حرم میں بے شمار بیویاں ہیں، جن کی فطری خواہش مہینوں بلکہ برسوں تشنہ رہتی ہیں، لیکن چونکہ ایک دفعہ خداوند مجاز" متمتع ہو چکے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے جسم کو کوئی نہیں چھو سکتا۔ وہ قلعہ نما محلوں میں قید رہتی ہیں۔ اور جب انہیں کوئی راستہ ملتا ہے تو وہ پرائے مردوں سے ملتفت ہوتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فحاشی کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں لیکن ایک بڑی وجہ ان متمول لوگوں کا نفسی ابتلا ہے، جب تک مرد اور عورت کے جنسی اختلاط میں توازن پیدا نہیں ہو گا، یہ فحاشی اور چکلے کبھی نہیں رک سکتے؟

!۔۔۔۔۔" لیکن اس کی بڑی وجہ اقتصادی بھی ہے"

"جی ہاں پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوتا ہے، لیکن اس میں جنسی خواہش کے فطری مطالبہ کو بھی بڑا دخل ہے۔"

"یہ صحیح ہے کہ آپ کے ہاں بڑے بڑے راہنما، ادبی و سیاسی آیا کرتے تھے؟"

"جی ہاں! ہر بڑا آدمی اس کوچہ سے رسم و راہ رکھتا تھا۔ یہ دو نسلیں تو میری نظروں کے سامنے گذری ہیں، دراصل ربع صدی پہلے کے لوگ طوائف کو ایک ثقافتی ادارہ سمجھ کر اس کے ہاں آتے تھے ان کا معاملہ جسم کا نہ تھا ایک تہذیب کا تھا۔ وہ بالاخانوں کو ایک کلب سمجھتے اور خوش وقت ہوتے تھے۔ سر سید شوق سے گانا سنتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ فراہم کرتے وقت انہوں نے ایک طوائف سے بڑی رقم حاصل کی۔ مولانا شبلی بھی آواز کا شوق فرماتے رہے ہیں۔ شرر مرحوم بھی چوک میں ہو آیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر میں اپنی آشنائی کا اقرار کر چکے ہیں، مولانا محمد علی سیاسی سفر میں بھی فیض آباد کی آواز سن آیا کرتے تھے علامہ اقبال کی امیر ابھی پچھلے دنوں مری ہے اور وہ جو کٹی کی دو بیٹیاں اڈہ شہباخاں میں بیٹھتی ہیں ایک بڑے رہنما کی قرار دلد مقاصد کا حصہ ہیں، ہا شاعروں یا ادیبوں کا حصہ تو ان کی کہانی کچھ ڈھکی چھپی نہیں، غالبؔ داغؔ کے ہاں بھی ایک طوائف تھی۔ قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کی محرک کون ہے۔ منی جان۔ جو تیس برس سے ان کے حرم میں ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے

بوٹا بیگم سے نکاح پڑھوایا تھا، الغرض ـــــــ ؎

چرائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں اپنی

"آپ نے ان لوگوں کی قربت سے کیا محسوس کیا؟"

"ہم کیا محسوس کرتے، یہ تو جو ان کی صحبتوں میں رہ چکی ہیں وہی کچھ کہہ سکتی ہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ حشر مختارہ کو جی جان سے چاہتے تھے، امیر سے کبھی اقبال کا ذکر آتا تو وہ بالا کہہ کر مسکرا دیا کرتی۔ کچھ بھی ہو، یہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان میں کوئی بھی گنوار کا لٹھ نہ تھا۔"

"وہ آپ نے نوابی غذاؤں کا ذکر کیا تھا، آپ بھی ان دسترخوانوں پر بیٹھی ہیں، کچھ معلوم ہے"ـــــــ

ـــــــ "اس میں علم یا خبر کی کوئی بات نہیں، مشہور کہاوت ہے۔" لگی سنوارے سالنا بڑی بہو کا نام" سب باورچیوں کے چونچلے یا چہلیں ہوتی ہیں کہتے ہیں واجد علی شاہ صبح کے ناشتہ میں پانچ سیر غذا کا پاؤ بھر جوہر نوش فرماتے تھے۔ ان کے لیے ایک سیر ملاؤ ۴۲ سیر گوشت کی یخنی میں دم ہوتا تھا اور اسے ہضم کرنے کے لئے آبدار خانے میں طبی اصول سے پانی تیار کیا جاتا تھا۔"

یہ محض من گھڑت افسانے ہیں، کہ کنچنوں کے گھر میں مرغن کھانے پکتے ہیں جیسی روٹی آپ کھاتے ہیں، ویسی یہاں پک جاتی ہے۔ کوئی مہمان ہو تو پھر

کہیں تکلف برتا جاتا ہے؟

مائی وزیر نے سگریٹ سلگا لیا اس کے تہ بہ تہ دھوئیں پر نظریں گاڑ دیں اور جب دھواں ہوا میں تحلیل ہو چکا تو اس نے کہا ــــــ جوانی سلفے کا ایک کش ہے اور بڑھاپا دھواں۔ جب یہ دھواں اڑ جاتا ہے، تو زندگی ختم ہو جاتی ہے ــــــ"

عجیب و غریب

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

اُس کی سرو قامتی آہو چشمی، سفید رنگت دوہرے دراز گیسو، ہونٹوں کی یاقوتی تراش، جسم کی نزاکت، سرمئی دوپٹہ، چوڑی دار پاجامہ اور پاؤں میں کمخواب کی جوتی شریر نگاہوں کو ضرور اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، جب وہ زاویے بناتا ہوا گزرتا ہے تو یہ دھوکا عموماً ہوتا ہے: کوئی بیاہتا عورت سسرال سے میکے جا رہی ہے۔ لیکن وہ پیدائشی مخنث ہے، اُس کی گفتگو میں رنگ روپ نہ سہی، رکھ رکھاؤ ضرور ہوتا ہے۔

"مجھے چند گھنٹوں کے لیے ملک کی حکومت سونپ دی جائے تو سب سے پہلے تین کام کروں:۔

پہلا، شراب فروشوں کو قید میں ڈال دوں، اور شرابیوں کو دُرّے لگاؤں

دوسرا، جواریوں کو اُلٹا لٹکا دوں، اور نیچے سے آگ کی دھونی دُوں۔

تیسرا وہ لوگ جو بہن اور بیٹی کی کمائی کھاتے ہیں، انہیں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دوں۔"

یہ تھا ہمارے آخری سوال کا جواب، جو خوبرو مخنث شوکت نے دیا، اور پھر زاویہ خاطر بناتا ہُوا ایسے نکل گیا، جیسے وہ حزبِ اختلاف کے پیچھے میں ہے، اور خوراک کے مسئلہ پر کچھ کہنے سے گریز کر رہا ہے۔

شوکت کی عمر اس وقت ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان ہے، بالا بلند، سرخ و سپید موٹی موٹی آنکھیں، کالے کالے دہرے بال، رخساروں پر نسوانیت کا ابریشمی پرتو، جب بولتا، گاتا یا ناچتا ہے، تو اس کی ایک ایک ادا کو دے اٹھتی ہے کہ وہ مخنث ہے۔

"کیا تم پیدائشی مخنث ہو؟"

"جی ہاں! لیکن مخنث تو پیدائشی ہی ہوتے ہیں۔"

"مگر اسی لاہور میں ایک لانبے قد کا مخنث "منیر جوگی" گھوما کرتا تھا، اب جانے کہاں ہے؟ اس نے مخنثوں پر ایک کتابچہ لکھا یا لکھوایا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ پیدائشی مخنث تو اکا دکا ہی ہوتے ہیں، سو میں سے پچانوے بنائے جاتے ہیں اور بعض تو مرد ہی ہوتے ہیں، اور بیشتر بچے کمسنی میں خصی کرتے

جلتے ہیں۔"

"ممکن ہے درست ہو، اس قسم کی باتیں سننے میں تو آتی ہیں، مگر مخنث جانے کا معاملہ کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض مرد شوقیہ مخنث بن جاتے ہیں، لیکن ہم انہیں نہ تو اپنے حلقہ میں بیٹھنے دیتے ہیں اور نہ ان سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔"

"شوقیہ مخنث ——— ؟"

شوکت نے میرے منہ سے بات چھین لی، اور خود ہی ذہن میں ایک سوال مرتب کر کے اُس کا جواب دینا چاہا۔

"جی ہاں! شوقیہ مخنث وہ نوجوان ہوتے ہیں جن کی طبیعتوں میں نسوانیت رچی ہوتی ہے۔ مثلاً ایسے نوجوان، جو ماحول یا فضا سے، نسوانی تاثر حاصل کرتے ہیں۔ کچھ ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں، جو محنت سے جی چراتے ہیں، اُن کے رگ و پے میں حرام سما جاتا ہے، اور اپنی جنسی خواہشات کو مفعولی جذبے یا نسوانی آرزو کے تحت از خود مفلوج کر دیتے ہیں" ——— جیسا کہ عرض کیا ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ ڈیرے دار انہیں اپنے ہاں ٹھہرنے دیتے ہیں۔"

"ڈیرے دار سے کیا مراد ہے ؟"

"جیسے خاندانی ننڈیاں "ڈیرہ دارنیاں" کہلاتی ہیں ایسے ہی ڈیرے دار مخنث ہوتے ہیں، جو گدی در گدی چلے آتے ہیں۔"

"لیکن کنچنوں کے تو اولاد ہوتی ہے اور تمہارے ہاں تو اولاد کا سلسلہ ہی منقطع ہے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن ہمارے ڈیرے چیلوں اور بالکوں کی جانشینی سے چلتے ہیں۔ ہم مخنث ایک دوسرے کو اپنا رشتہ دار سمجھتے ہیں، ہماری ایک خاص معاشرتی زندگی ہے۔ ہم کسی دور دراز شہر میں بھی چلے جائیں تو وہاں کے ڈیرے دار کا فرض ہو جاتا ہے کہ جب تک ٹھیریں، وہ ہمارے قیام و طعام کا انتظام کرے اس کو ہماری مدارات سے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی خوشی کہ ایک عزیز کو دوسرے عزیز کی ملاقات سے ہو سکتی ہے۔ لیکن بھولئے نہیں کہ ہیجڑوں کی بھی قسمیں ہیں، جیسے عورت کی قسمیں ہیں۔ **باکرہ، دوشیزہ، دلہن، ادھیڑ، بوڑھی،** ہمارا مقام کبھی محلوں میں تھا، اب جھونپڑوں میں بھی نہیں، کبھی حرم سراؤں کی محافظت پر مامور تھے۔ اب در در کی بھیک مانگنے پر مجبور ہیں، زمانہ زمانہ کی بات ہوتی ہے۔" ———— ع

کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

"لیکن یہ مخنث ایشیائی ملکوں ہی میں نظر آتے ہیں کسی یورپی ملک میں تو ان کا وجود ہی مفقود ہے؟"

"جب اس ملک میں مخنث پیدا ہوتے ہیں تو یقیناً یورپ میں بھی ہونگے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں ہماری طرح انہیں ایک ادارے کی حیثیت حاصل نہ ہو

ہماری بادشاہت بے دے کے ملک کافور سے شروع ہوئی اور ملک کافور پر ختم ہو گئی یا شجاع الدولہ فرمانروائے اودھ کے عہد میں ہمارے بھائی بند افواج کے سالار تھے، ان کے بعد تو شیرازہ ہی بکھر گیا اور وہ زمانے ہی خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ کہاں پادشاہوں کی مصاحبت اور کہاں آبرو فروشوں کی معیت"

"مگر تم لوگ کاروبار کیوں نہیں کر لیتے؟"

"کاروبار ——؟ شوکت کے چہرے پر ایک قہقہہ سا پھیل گیا —— مردوں ہی کے بٹے کونسا کاروبار ہے کہ آپ ہمیں تلقین فرما رہے ہیں، ہر جماعت کی ایک زندگی ہوتی ہے اور وہ اس کے مطابق لشتم پشتم بسر کرتی ہے، قدرت نے ہمیں اس زندگی کے لیے پیدا کیا ہے، سو وہ جیسی بھی ہے، گذر رہی ہے، جب معاشرہ کی حوصلہ افزائی اور ہماری تن آسانی نے ہمیں اس ڈگر پہ لا ڈالا ہے۔ تو پھر اس کے سوا کاروبار کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

"تو کیا تمہارا شغل محض گانا بجانا ہے؟"

"جی ہاں، بہ ظاہر تو یہی ہے، لیکن بازاروں میں ہم لوگوں کے اصرار پر ناچتے اور گاتے ہیں اور کچھ پیٹ کی مار بھی شامل ہوتی ہے، ویسے ہمارا کام دو گھروں تک محدود ہوتا ہے، ایک جہاں لڑکا پیدا ہو، دوسرا جہاں لڑکے کا بیاہ ہو، لڑکی کی پیدائش اور شادی پر مانگنا ہمارے ہاں نامناسب ہے۔"

"لیکن سب مخنث تو خوش آواز نہیں ہوتے۔"

"جی ہاں! آپ کا ارشاد صحیح ہے لیکن مخنث نہ تو خوش چہرہ ہونے کی وجہ سے مانگنے جاتا ہے اور نہ خوش آواز ہونے کی وجہ سے، وہ تو محض مخنث کی حیثیت میں مانگتا ہے۔"

"اور یہ جسمی تعلقات؟"

اُس نے فوراً ہی میری بات اٹھالی اور گونجدار لہجہ میں بولا۔

معاف کیجیے سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے، کچھ "دانے" گندے بھی ہوتے ہیں، کیا مردوں میں بدکار نہیں؟ عورتوں میں بدقماش نہیں، جو حالت آج ہو رہی ہے اور جو کچھ مجھے معلوم ہے ——— مشاہدے، مطالعے، اور تجربے کی بنیاد پر ——— ناگفتنی ہے۔ ہمارا وجود تو آٹے میں نمک کے برابر ہے، بلکہ ماش کے دانے کی سفیدی سے بھی کم تر ——— لیکن عورتوں، اور مردوں کا تناسب تو چشم بددور روز افزوں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم من حیث الجماعت بدنام ہیں۔"

"لیکن بازار تنیجہ پوریاں کی ایک تاریک سی گلی میں تو ———؟"

"جی ہاں میں سمجھ گیا!"

"ایک دو مخنث، دو کانوں کے چبوترے پہ بیٹھے ہوتے ہیں، اور پھر اُس نے ایک سرد آہ کھینچی ——— بس یہ سمجھ لیجئے کہ اُن کا بڑھاپا ویران ہو چکا ہے۔ وہ برگد کے ایک ایسے درخت کی اُداس چھاؤں ہیں جس کی دوپہر خانہ بدوشوں کو سہارا دیتی ہے۔"

"اچھا تم کیا کما لیتے ہو؟"

"ہیں ؟ ان دنوں تو مندا ہے، لیکن پھر بھی خدا کے فضل سے دو اڑھائی سو ماہانہ مل جاتے ہیں، اس میں ایک تہائی سازندے لے جاتے ہیں اور دو تہائی ہمارا ہوتا ہے۔

آغاجی! ہماری قدر تو ہندو لوگ کیا کرتے تھے، اُن کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو کئی کئی مہینوں کے پیسے بے نیاز کر دیتے تھے۔ ادھر ہندو عورتیں ہمیں بابا لوگ کہتی تھیں لیکن مسلمان تو زبان سے بھی پتھر لڑھکاتے ہیں، بوڑھے ہیں تو وہ رمز کی بات کرتے ہیں، جوان ہیں تو وہ چٹکی لیتے ہیں، بچے ہیں تو وہ تالیاں پیٹتے ہیں۔ الغرض آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

"لیکن تم اتنا روپیہ کیا کرتے ہو؟"

"اپنی ذات کے لیے تو لوگوں کا دیا ہوا روٹی کپڑا ہی کافی ہے لیکن میرے کاندھوں پر فرض کا ایک بوجھ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"والد لدھیانے میں ایک بڑے خیاط تھے، کاروبار اچھا تھا، اپنے چھ مکان تھے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں،— چار بہنیں،— دو بھائی، میں مخنث نکلا، دوسرا بھائی ۱۹۴۷ء کی قیامت میں کام آگیا، والد ضعیف العمر ہیں۔ امی اسی سن کو پہنچ چکی ہیں۔ جب تک لدھیانہ میں رہے، میری کمائی کا ایک دھیلہ بھی حرام

سمجھا، اب جو ٹُٹ پٹ کے لاہور پہنچے، تو کوئی سہارا نہ تھا، میں نے ان کی خواہش کے خلاف ہاتھ بٹایا —— ایک بہن بیاہی ہوئی ہے اور اُس کا شوہر سرکاری ملازم ہے، دوسری نے اس سال میٹرک کیا ہے، تیسری نے آٹھویں میں امتیاز سے کامیابی حاصل کر لی ہے، چوتھی تیسرے درجے میں ہے، لیکن میں نے پہلی دو بہنوں کو مزید تعلیم سے روک دیا ہے "۔

"کیوں ؟"

"میاں! دریا میں جو کچھ جال دیکھتا ہے، وہ مچھیرا نہیں دیکھتا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری تعلیم کا جدید نقشہ ہمیں اخلاقی انحطاط کی طرف لے جا رہا ہے —— ایک دن میری بہن نے مجھ سے کہا —— بھائی جان! ہم سبق لڑکیاں ہماری مینڈھیوں کا مذاق اُڑاتی ہیں، وہ کہتی ہیں، ابھی تک پرانی قطع کے بال بناتی ہو، کئی دفعہ سفید برقعوں کو بھی ٹوکا ہے۔ میں چپ ہو رہا —— تیسرے روز دیکھا تو بہن بالوں کو سلجھا رہی ہے۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کر انہیں اسکول سے اٹھا لوں —— کیونکہ بالوں کا سلجھاؤ ہی دلوں کا الجھاؤ بنتا ہے "۔

"شوکت تم بڑے باخبر ہو"

"صرف اس لئے کہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھتا ہوں، آپ حیران ہونگے کہ میں نے گھر میں ریڈیو نہیں رکھا "۔

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ ریڈیو مشینی استاد جی ہے اور لڑکیاں اس سے تال سُر نکالنا سیکھتی ہیں۔ آپ باور کیجئے ہماری معاشرتی زندگی میں جو نفسانی بے راہ روی اُبھر آئی ہے، اس کی ایک وجہ ریڈیو بھی ہے"۔

"اچھا یہ کہو! ہر مخنث کے لیے ایک حلقہ مخصوص ہوتا ہے ؟"

"جی ہاں! ہر مخنث کے لئے ایک حلقہ مخصوص ہے، وہ اس سے باہر کمانے کے لئے نہیں جا سکتا۔ ہر حلقہ اس کی موروثی جائداد ہے، جب وہ مرتا ہے تو اپنے علاقائی مخنث جانشین کے نام ہبہ کر جاتا ہے"۔

"قانوناً ؟"

"جی نہیں، پنچایت کے روبرو "وصیت" ہو جاتی ہے۔ مثلاً قلعہ گوجر سنگھ کا علاقہ ہے، یہ حلقہ میرے پاس ایک سکھ ہیجڑے نے تین ہزار روپے میں، قبل از تقسیم گروی رکھا تھا، جب بٹوارہ ہو گیا، تو وہ اپنے والدین کے ہمراہ مشرقی پنجاب چلا گیا، میں لدھیانے سے لاہور پہنچا، اور اپنے تصرف میں لے آیا۔ لاہور کے مخنثوں نے کوشش کی کہ تین ہزار روپے لے کر یہ علاقہ اُن کے نام منتقل کر دوں، لیکن ایک تو میں مہاجر تھا، دوسرے مجھے کوئی نہ کوئی حلقہ الاٹ ہونا چاہیے تھا"۔

"تو کیا یہ حلقہ تمہیں محکمۂ بحالیات نے الاٹ کیا ہے ؟"

شوکت نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

"جی نہیں، پنچایت نے! محکمہ بحالیات نے تو مجھے مخنث سمجھا، اور مکان بھی الاٹ نہ کیا، حالانکہ میرے والد تو دو لٹوں سے کہیں زیادہ صاحب جائداد تھے؟"

"تمہارا کوئی پیر اُستاد ہے؟"

"جی ہاں! ہم اپنے پیر کو گورو کہتے ہیں، ہماری بڑی گدی راولپنڈی میں ہے! اور بخشو کی گدی کہلاتی ہے اس گدی کی آمدنی خاصی ہے، یوں کہئے سونے میں تلتی ہے، اور جائداد بھی خاصی ہے،

دوسری گدی لاہور میں ہے — ہیرا منڈی کے علاقے میں — اس کو بابا رکھا کی گدی کہتے ہیں۔"

"لیکن اس گدی میں تو سبھی کچھ چلتا ہے"!

"یہ سبھی کچھ کیا ہے"؟ — شوکت نے بات اچھالتے ہوئے کہا — "اور پھر سبھی کچھ کہاں نہیں چلتا؟ کیا زندگی کا کوئی گوشہ خالی ہے"؟

شوکت کے لہجہ میں خود اعتمادی کا عنصر شامل تھا، اُس نے بتایا

"آپ لوگ ہمیں حقارت سے دیکھتے ہیں، ہمیں پوچھئے کہ معاشرہ کی حالت کیا ہے، لوگوں کی اخلاقی حالت کہاں سے کہاں نہیں آپہنچی؟ جن لوگوں کو آپ محلوں کے آقا، اور مسندوں کے وارث کہتے ہیں، ان کا باطن ہم پر روشن

ہے، میں نے گانے یا بجانے ہی میں عمر نہیں گذاری۔ ہزاروں انسانوں کو بھی دیکھا ہے، معاف کیجئے میں ہر انسان کی آنکھ کو پہچانتا ہوں، اس کی ایک ہی گردش مجھے اس کے مافی الضمیر تک لے جاتی ہے۔"

"ملک بھر میں کتنے مخنث ہونگے"؟

"میں نے شمار تو کیا نہیں، لیکن جو ظاہر ہیں ان کی تعداد پانچ چھ ہزار سے کیا کم ہو سکتی ہے۔"

"اور جو "پوشیدہ" ہیں؟"

"ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، خدا ہی بہتر جانتا ہے؟"

شوکت نے اپنے معاشرہ کی رسموں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جب ہم میں سے کوئی مخنث اپنے چیلے کو نکال دیتا ہے، تو کوئی دوسرا اسے لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا جب تک پنچائت اپنا فیصلہ نہیں دیتی۔"

پنچائت کا فیصلہ کبھی تو سینکڑوں روپے جرمانہ تک پہنچتا ہے، اور کبھی صرف جوتی میں تیل ڈلوا لیا جاتا ہے۔"

"جوتی میں تیل ——— ؟"

"جی ہاں! ہمارے ہاں اس کو برا عیب سمجھتے ہیں، بلکہ ہم لوگ جرمانے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

شوکت نے کہا، بعض لوگ ہمارا ڈانڈا "بھانڈوں" سے ملاتے ہیں، لیکن

اُن کے اور ہمارے درمیان دور کا ناطہ بھی نہیں، ہم نقلیں نہیں کرتے، نہ کسی پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں، ہماری زندگی مستعار فقیرانہ ہے، اور صرف لوگوں کو دعائیں دینے میں گذر جاتی ہے!

"کبھی تمہاری میت دیکھنے میں نہیں آتی"

وہ ہنسا اور کہا آپ بھی عجیب سوال کرتے ہیں، معاف کیجئے نہ تو ہم آسمان سے ٹپکتے ہیں، اور نہ آسمان پر اُڑ جاتے ہیں، ہمیں بھی ماں کی کوکھ ہی جنتی، اور ہمارا جنازہ بھی مرد ہی لے جاتے ہیں۔

"اور نماز جنازہ کون پڑھاتا ہے؟"

"مولوی"

"مولوی؟؟؟"

"جی ہاں! شوکت نے اس تحیر کو جھٹلاتے ہوئے کہا:

"کیا ہم ٹکے نہیں دیتے؟ مولوی تو ٹکے اور چھوہارے لے کر دو جسموں کو ملا دیتا ہے۔ اسی ملّا نے فتویٰ دے کر کعبہ پر گولیاں چلوا دی تھیں، اور یہ تو میت کے دفنانے کا مسئلہ ہے۔ پھر کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟

ہمارے دل بھی خدا کے خوف سے لبریز ہیں، ہم بھی اسلام کو مانتے ہیں۔ پیر فقیر مناتے ہیں، نذر نیاز دیتے ہیں، داتا کی حاضری بھرتے ہیں۔ گنج شکر کے روضے پر جاتے ہیں، بری امام کے سلام کو پہنچتے ہیں۔ اب تو خیر سرحد پر ہو میں

رات کی بات

عورتیں تصویریں ہوتی ہیں اور مرد معمہ؛ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ
عورت کا واقعی کیا مطلب ہے؟ تو اس کی طرف دیکھو، اُس کی
سُنو نہیں ——— (آسکر وائلڈ)

یہ غالباً ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء کی شب کا ذکر ہے، پاکستان میں پہلا یوم
اقبال تھا، اِدھر یونیورسٹی میں حکیم الامت کے عقیدت مند فلسفۂ خودی چھانٹ
رہے تھے، اُدھر ریڈیو سے کلامِ اقبال نشر ہو رہا تھا، اور کہیں کہیں فٹ پاتھ
پر خوش لحن فقیر "ساقی نامہ" الاپ رہے تھے ———

——— گیا دورِ سرمایہ داری گیا

خان کو اصرار تھا کہ ہم اس کی معیت میں امیر سے ملیں، علامہ اقبالؒ

آغازِ جوانی میں اسی امیر کی آوازہ کے معترف تھے اور یہ حسن اتفاق تھا کہ اسی روز اس کے ہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا، سب پشتینی رنڈیاں اس کے ہاں مدعو تھیں، امیر کی بیٹیاں جن کا آفتاب ان دنوں نصف النہار پر ہے، اس ڈار میں خوبصورت کبوتریوں کی طرح غٹرغوں غٹرغوں کر رہی تھیں۔ تمام احاطہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا جیسے اپسراؤں کا کوئی غول ستاروں سمیت کرۂ ارضی کی اس ٹکڑی پر اتر آیا ہے۔

آج کی رات اُف او میرے خدا آج کی رات ——

امیر کا سن ساٹھ سے کچھ اوپر ہے، ممکن ہے کبھی خوب رو ہو، لیکن اب عمرِ رفتہ کا ایک جھوٹا جھول ہے۔ یا بظاہر چچوڑی ہوئی ہڈیوں کا ایک ڈھیر جس میں دھوئیں کی غٹر اندر رہ گئی ہے، رنگ سنولا چکا ہے، بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے بال سفید ہو چکے ہیں، دانتوں میں کھڑکیاں نکل آئی ہیں، اور لہجہ مریل ہو چکا ہے۔

انہی نے کہا، خالہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، امیر نے آنکھیں کھول دیں، گویا کسی بھولی بسری حکایت کا تعاقب کر رہی ہیں، ہم نے سوال کیا، تو اُس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مسکرائیں، جیسے کسی گمشدہ کہانی کے الفاظ بکھر گئے ہیں، اور وہ انہیں ایکا ایکی جوڑ دینا چاہتی ہے۔ اقبال کے نام سے ——

—— اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اٹھا لیکن بسرعت مدھم ہو گیا، گویا گفتن سے ناگفتن بہتر ہے۔

اس نے کچھ بتانا قبول نہ کیا، ہمارا اصرار بڑھا تو قدرے جھنجھلا کر کہا

"ہمارے ہاں مُردوں کے کفن پھاڑنے کا رواج نہیں، انسانی گوشت کی چاٹ بُری ہوتی ہے۔ ایک دفعہ مُنہ لگ جائے، تو پھر شراب کے نشہ سے بڑھ کر خوار کرتی ہے، اس عمر میں انسان کو خوفِ خدا کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا، جب خدا کا خوف نہیں تھا تو سب کچھ یاد تھا۔"

ہم نے بات کو طول دینا چاہا، اور تقاضا کیا کہ وہ ان صحبتوں کی کوئی کہانی چھیڑے، جب اقبال، عبدالقادر، گرامی، ناظر وغیرہم حاضر رہتے تھے، لیکن اُس نے کھُلے کھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا، اور پھر ذرا ترش ہو کر کہا۔

"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔" میں کوئی کتاب نہیں کہ اٹھایا، ورق پلٹے، جس صفحہ یا پیرے پر نظر ٹھہری، اس کو کھنگالنا شروع کیا، ہماری باتیں ہمارے ساتھ مرچکی ہیں، آپ اُن "زندوں" ہی کی ٹوہ میں رہئیے جو آپ کی زندگی میں راہنما ہو سکتے ہیں، اُن باتوں کی کھوج سے فائدہ؟ جو آپ کو تو نفع نہیں دے سکتیں لیکن دوسروں کو محض اس لیے نقصان پہنچتا ہے کہ آپ کے کان اس ذائقہ کے عادی ہو چکے ہیں؟

ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر اس معاملہ میں ایک سرِ خفی ہے، اُس کا روپ مرچکا ہے، لیکن اس کی آن نہیں مری، اس کی خودی زندہ ہے۔

———— اُدھر ابھی تقریب کا رنگ نہیں بندھا تھا، ایک طرف

اُستاد جی، حقوں کا دھوآں اڑا رہے تھے، دوسری طرف رنڈیوں کی رنگارنگ آوازیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی تھیں، شب کا پہلا پہر تھا، اور مدعوین عموماً رات کے نصف ثانی کے آغاز میں جمع ہوتے ہیں —— قاضی نے کہا چلو اتنے میں نایاب کے ہاں سے ہو آتے ہیں، ہمارے ایک دوست جو نامور باپ کے بیٹے اور خود بھی نامور تھے، اس طرح گھومنے پھرنے کے خلاف تھے، اور اُن کا خوف بڑی حد تک جائز تھا۔ یہ محض چوری چھپے کا تماشا دیکھنے کے لئے چلے آئے تھے، اور اس میں بھی زیادہ تر امیر سے ملاقات کا شوق تھا۔

بالآخر مان گئے اور جب پکھراج منزل کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نایاب ریشم کے ڈھیر کی طرح سامنے آ بیٹھی، اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ آداب عرض کیا، ان حضرت کی آنکھیں بھی چندھیا گئیں، خواجہ سے کان میں کہا: بھائی بزرگوں نے غلط نہیں کہا کہ معصیت میں بڑی دلکشی ہوتی ہے۔

ان گھروں میں گاہکوں کی کھسر پھسر کو ناگوار سمجھا جاتا ہے، نایاب کی نانی جس کی عقابی نظریں گاہکوں کے تیوروں سے ان کی غایت پہچان لیتی ہے، اس سرگوشی پر کہاں چوکتی، ایک برجستہ فقرہ کسا، غالباً کرخنداروں کے ہاں کا کوئی محاورہ تھا اور گلوری بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے شوق فرمایئے"

خواجہ نے کہا —— "آپ نے زندگی میں پہلی دفعہ . . . ؟"

نائکہ نے قطع کلام کیا ——— "جی ہاں تو ابھی عمر ہی کیا ہے — ع
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

"محض ہمارے اصرار پر یہاں تک چلے آئے ہیں، ورنہ ان کے لئے یہاں دلبستگی کا کوئی سامان نہیں، ان کا اوڑھنا بچھونا تو کتابیں ہیں"۔ خواجہ نے کہا۔

——— "جی ہاں، وہ تو ان کا چہرہ بول رہا ہے، اوڑھنا بھی کتابیں اور یہ بچھونا بھی کتابیں؟ (اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا)، لیکن بڑھیا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میاں، یہ حجاب اولی زیادہ دیر نہیں رہتا، ان بازاروں میں ہرن بھی چوکڑی بھول جاتے ہیں، کون ہے جو اس شاہراہ سے نہیں گزرا، جن لوگوں کی عزت ایک اجتماعی سرمایہ یا قومی ملکیت ہوتی ہے، وہ بھی عمر کے کسی موڑ میں اس کوچہ کی آب و ہوا سے ضرور مستفید ہوتے ہیں، یہ بھول سرراہ سہی، لیکن بھول تو ہیں، معاف کیجئے، پنجاب میں تو طبیعتوں کا رجحان قدرے مختلف ہے اور لوگ ہم نشینی کی بجائے ہم جنسی کو چاہتے ہیں، مگر اُدھر دہلی و لکھنؤ میں بڑے بڑے شرفا مجلس آرائی کے لئے آتے تھے۔

سرسیدؒ کانوں کے رسیا تھے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ تو کلکتہ کی ایک جانی پہچانی طوائف نے انہیں چندہ میں بہت سا روپیہ دیا تھا، مولانا شبلی مرحوم کی ثقاہت میں کسے کلام ہے، لیکن وہ بھی آواز پر مرتے

تھے۔ اکبر الہ آبادی نے تو خیر ایک طوائف ہی کو اپنے گھر میں بسا لیا تھا؛ اور نواب نصیر حسین خیال بھی ایک زندہ دل انسان تھے۔ غرضیکہ اس دور کا ہر شاعر، یا ادیب ان مکانوں کی سیاحت پہ مرتا تھا، ادھر سیاسی راہنماؤں میں مولانا محمد علی مرحوم و مغفور جب کبھی کلکتہ جاتے، یا لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد کے ہاں قیام ہوتا تو زہرہ و مشتری کے ہاں بھی ایک آدھ نشست جما لیتے تھے۔ چونکہ من اُجلا تھا اس لئے اس میں کوئی عیب نہ دیکھتے تھے۔ حکیم اجمل خاں کے زہد و ورع پر انگلی رکھنا خود ایک عیب ہے، لیکن تحریک خلافت کے دنوں میں بھی وہ کبھی کبھار خوش وقت ہو لیتے تھے۔ اور پھر ان کے ہاں جو لوگ جمع ہوتے تھے اُن کے علم و نظر کی مثال پورے ملک میں عنقا ہے۔

یہ آپ کے ہاں علامہ اقبال کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں، کیا اُن کی عظمت پر بھی کوئی حرف رکھ سکتا ہے؟ لیکن یہ زمانہ زمانہ کی بات ہے، اُس زمانے میں ہم لوگ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے، اور اب ہماری حیثیت ایک اڈے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اڈوں پر انسانی آبرو زنگ کھا جاتی ہے۔"

"تو آپ نے ثابت یہ کیا کہ آپ کے مکانوں کو بڑے بڑے لوگ نوازتے رہے ہیں۔"

"آپ کا فقرہ قدرے پہلو دار ہے، میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بڑی بڑی ہستیوں کے سوانح حیات میں چند ورق نہ سہی، چند صفحے ہی سہی، چند

صفحے نہ سہی، چند حواشی ہی سہی، ایسے ضرور ہیں، جن کا رنگ روپ، اس بازار سے مستعار ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ حج کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔

• • • • •

!! ——— ان کے ہاں تعلقات کا واحد معیار روپیہ ہے، کوئی بائی جی ملازم ہوں اور آپ انکے ہاں شب و روز محفل لگائیں تو انہیں اعتراض نہیں ہوگا، یہ ان کا پیشہ ہے، وہ روپیہ اور وقت تبادلہ کی جنس خیال کرتے ہیں۔ یا پھر آپ شب کو تشریف لے جائیے، گانا سنئے، گرہ ٹٹولئے، روپیہ نہ ہے تو اٹھ آئیے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں کوئی تیسری راہ نہیں ہے، وہ لوگ "سادہ تعلقات" کے قائل ہی نہیں، اور نہ انہیں مجلسی تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، آپ نے "قدم رنجہ" فرمایا، نائکہ نے تنقیدی شکنوں سے استقبال کیا۔ سازندوں نے کن انکھیوں سے تاکا، "مغنیہ" نے رواجاً آداب عرض کہا، آپ نگاہ میں جچ گئے تو چلئے حاضر ہے، یمین حاضر ہے، پان حاضر ہیں، اور دو چار رسمی فقرے بھی "حاضر" ہیں، اور اگر نہ جچے نہیں تو پھر ظاہری برتاؤ بھی غائب، گانا سنئے، پیسے دیجئے۔ سلام علیکم، وعلیکم السلام، بالخیر و شما بسلامت ——— اور یہ چند منٹ کی رسمی گفتگو سازندوں کی تیاری تک ہوتی ہے، ادھر طبلے پہ تھاپ پڑی، مغنیہ نے انگلیوں سے غیر مرئی بول کا دائرہ باندھا، قہقہے منقطع ہوگئے اور نغمہ چھڑ گیا ———!

ب ——— نایاب کی حنائی انگلیاں ستار تک پہنچ چکی تھیں، اُس نے ستار کے لہجہ میں بہت کچھ کہا، ہم میں سے کوئی بھی ستار کی زبان نہ جانتا تھا، اتنا معلوم تھا کہ اس کے موجد امیر خسرو تھے، یا یہ کہ تاریں باج کی آواز مدہم سُر سے ملائی جاتی ہے۔ دو پیتلی تار کھرج کی سُر رکھتے ہیں، چوتھا تار فولادی پنجم کا سُر نکالتا ہے۔ پیتل کے لرز کا تار سپتک کے پنچم کی سُر نکالتا ہے۔ دونو چکارے کھرج کی آواز دیتے ہیں، اور باج کے علاوہ جو تار بجتے ہیں وہ اُس کا کام دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے سُروں میں ایک آگ سی سلگتی گئی، اور دیکھتے دیکھتے شعلہ جوالہ بن گئی۔ ہمارے نزدیک یہ ستار کے تاروں کا کمال نہ تھا، بلکہ اُن حنائی انگلیوں کا جادو تھا جو پیتل کے تاروں میں ڈھلتے ڈھلتے نغمہ بن گیا تھا۔

——— آبشار سیمیں۔

نایاب کی پیشانی پر قطرے ڈھلک رہے تھے، الحمدی نے کہا، ان تاروں میں جان پیدا کرنے کے لئے بھی، روح صرف کرنی پڑتی ہے، جہاں شاعر کا ذہن سوچتا ہے، وہاں مغنیہ کی انگلیاں بولتی ہیں،

نایاب نے داغ کی غزل چھیڑی، حافظ نے روک دیا، اور خواجہ نے کہا "اقبال گاؤ" نایاب نے ذہن کے کسی گوشے میں نقب لگائی، ماتھے پر بل ڈالا، اور بول اٹھایا،

کافر گیسوؤں والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

قاضی نے وہیں کاٹ دیا، یہ شعر اقبال کا نہیں، ساغر نظامی کا ہے،

نایاب نے کچھ اور سوچنا چاہا، لیکن پھر معذرت چاہی

"معاف کیجیے، اس وقت ذہن میں اقبال کا کوئی شعر نہیں آ رہا ہے"

"جی ہاں یوں بھی آپ کی طرف کے لوگ اقبال سے جی چراتے ہیں"

"جی نہیں، میں نے تو پنجابی گیت بھی یاد کئے ہیں"

"معتقد تا یا ضرورتاً" قاضی نے طنز سے پوچھا۔

"جیسا آپ خیال فرمائیں"

المحمدی نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا

"میاں ضرورت کیا کچھ نہیں کراتی، یہ جو ہم ہر کہ و مہ کے نوک زبان ہیں،

کیا، یہ ضرورت نہیں۔ یہ بھی تو ضرورت ہی ہے، نائیٹڈ (نایاب کا مخفف) ابھی بچہ

ہے، ابھی پکے راگ سیکھ رہی ہے، یہی کوئی دس بارہ غزلیں اور وہ بھی آپ ایسے

کرم فرماؤں کی یاد کر لی ہیں انہیں گا لیتی ہے"

"تھوڑے دن ٹھہر جائیے، کلامِ اقبال بھی حفظ کر لیگی"

• • •

"فریدہ کے ہاں چلو، اس کی آواز کا خاصا چرچا ہے"

"لیکن وہ تو مدیروں کی نہیں، وزیروں کی ہے۔ آج کل سیدھے منہ بات

نہیں کرتی۔ عشاق نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں" اسمٰعیل نے کہا

"تو کیا وہ اس تقریب میں نہ ہو گی؟" ۔ قاضی نے استفسار کیا۔

"ہونا تو چاہیے لیکن ہم لوگ وہاں کیونکر بیٹھ سکتے ہیں، ان میں یا تو وہ لوگ بیٹھیں جن کی جیب بھری ہو، یا وہ جائیں جن کی غیرت مری ہو" خواجہ نے کہا۔

"لیکن خان نے تو علٰحدہ انتظام کر رکھا ہے، اوپر بالکونی میں چک لگا دی گئی ہے"

"چلتے ہیں، جیسی فضا ہو گی، ویسا طے کر لیں گے، یوں بھی بارہ بجے شب سے پہلے ایسی محفلیں کہاں منعقد ہوتی ہیں۔ ہمیشہ اس قسم کی تقریبیں نصف شب کو شروع ہوتی ہیں۔ پہلی نصف رات تو ہر بائی کے اپنے کاروبار کی ہوتی ہے"

ممتاز نے پکارا، —— "آغا جی، آپ کہاں پھر رہے ہیں، آئیے نا، خالہ وزیر بیٹھی ہیں، وہ آپ کو پوچھ رہی تھیں"

"آج تو آپ کے ہمسایہ میں جشن ہے، کیا آپ لوگ نہیں جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں! اس جشن کے لئے تو شہناز نے سلمے کا نیا سوٹ سلوایا ہے، وہ دیکھئے نا، ذوق کے قصیدوں کی طرح بوجھل بنی بیٹھی ہے"

اور یہ ممتاز کا خاص رنگ ہے،

وزیر ممتاز بادے والی کی ماں ہے، آٹھوں گانٹھ کمیت ہے اور ایک کھری نائکہ ہے، اُس کے چہرے کی تیوری میں بہت سی کہانیاں خوابیدہ ہیں، اُس کی آنکھوں میں ابھی تک ماضی کی دمک ہے، آواز میں بھی کھنک ہے، بدن ڈھلک

گیا ہے، لیکن رنگ کی ڈھلک باقی ہے۔ لہجہ میں تمکنت ہے۔ وزیر نے گامے سے کہا حقّے لاؤ، حقہ آگیا، اور نَے کو منہ سے لگا کر یوں مبجھ گئی، جیسے کوئی بانکا چودھری گدی پر بیٹھے بیٹھے گھوڑیوں کی سوداگری کرتا ہے۔

"آغا جی کہیے طبیعت کیسی ہے؟"

"خدا کا شکر ہے آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بس خدا کا احسان ہے، جو بیت چکا ہے، اس کا غم نہیں، جو بیت رہا ہے اُس کا گلہ نہیں، جو بیتنے والا ہے اُس کی فکر نہیں، اس چل چلاؤ کا نام ہی زندگی ہے"

"ممتاز، آپ کی بہت تعریف کرتی ہے کبھی یہ تو فرمائیے کہ جو زمانہ بیت چکا ہے کچھ اُس کی یادیں بھی آپ نے محفوظ رکھی ہیں"

"جی ہاں! یادیں ہی تو باقی رہ جاتی ہیں، اب تو ایک آہ سرد کے سوا کچھ باقی نہیں رہا —— اور پھر آپ جانتے ہیں زندگی میں جو لمحے رہنے کے قابل ہوتے ہیں وہ وہی ہیں جو بسر کیے جا چکے ہیں"

ابو یوسف نے کہا "یہ تو آسکر وائلڈ کا مقولہ ہے"

ممتاز نے بات اُچک لی، اور چٹکی لیتے ہوئے کہا

"جی ہاں، خالہ وزیر بھی تو پچپن جوبن میں سائرہ تھیں"

وہی قہقہے —— حسن اتفاق سے صابری بھی آگئے، قاضی کہہ رہا تھا

"ممتاز کو سمجھنا بڑا ہی مشکل ہے۔"

صابری نے کہا، کیوں؟ یہ بھی کوئی بجھارت ہے؟"

"بجھارت نہیں، یہ تو "نارد منی" ہے۔"

"وہ کون تھا؟"

ممتاز نے حسب دستور قہقہہ لگایا، اور کہا

"قاضی جی کا ہمزلف"

وزیر نے کہا "قاضی جی! عورتیں اس لئے نہیں بنی ہیں کہ ان کو سمجھا جائے وہ تو محبت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن محبت بھی تو ایک جنسی جذبہ ہے۔"

"جی ہاں! ہم اور آپ سب جنسی جذبے ہی کی پیداوار ہیں۔" ممتاز نے پھر ٹوکا۔

خواجہ نے قاضی سے کہا ——— "بھائی! ممتاز سے جیتنا سہل نہیں۔ یہ تو ذہانت کی پھلجھڑی ہے۔"

ممتاز نے سگریٹ سلگایا اور وزیر سے کہا "خالہ! یہ اپنی کتاب کے لئے کچھ سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"مثلاً؟" وزیر نے دریافت کیا

"مثلاً (ممتاز نے آنکھیں مارتے ہوئے کہا) مثلاً جوانی کا تجربہ؟"

وزیر کھلکھلائی، جیسے وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔
ممتاز نے حسب عادت پھر چُسکی لی اور کہا یہ تجربہ نام ہے جگ بیتی یا آپ بیتی کا"

ابو یوسف نے کہا "جی نہیں آسکر وائلڈ کے الفاظ میں — ہم کرتے ہیں غلطیاں اور اس کا نام رکھتے ہیں تجربہ"

وزیر نے کہا "بالکل ٹھیک یہی وجہ ہے کہ دنیا ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھاتی ہے، بلکہ ہر انسان نیا تجربہ کرتا ہے"

"ٹھیک ہے، انسان ہمیشہ سے تجربوں کی گذرگاہ میں رہا ہے، لیکن یہ آپ کے ہاں بڑی بوڑھی عورتوں کو نائکہ کیوں کہتے ہیں؟

"اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ تو آپ ادیب لوگ ہی جانتے ہیں، لیکن جب رنڈی بوڑھی ہو جاتی ہے، تو اس کو نائکہ کہتے ہیں"

"ممکن ہے یہ نائک کی تانیث ہو" ممتاز نے حسب عادت اشتعلہ چھوڑا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے، پہلے زمانہ میں جو سپاہی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکتا تھا اس کو اخیر عمر میں نائک کا عہدہ ملتا تھا، یہی حال رنڈی کا ہے۔ جب وہ اُتار دہو چکتی ہے، تو بڈھی ہونے پر نائکہ کہلاتی ہے" —— قاضی نے کہا

"کیا اصل لفظ نائچہ تو نہیں ہے؟" خواجہ نے سوال کیا۔

"جی نہیں، ناٹچہ کے معنی ہیں حقے کی نے"۔ اسمٰعیل نے جواباً کہا

تو پھر یہ ناٹچہ ہی ہے (ممتاز نے گفتگو قطع کرتے ہوئے کہا) حقے کی نے

بھی مُنہ لگی ہوتی ہے اور نائکہ بھی اس رنڈی کو کہتے ہیں جو مُنہ لگ چکی ہو،

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وزیر نے کہا ——— آپ بوڑھی رنڈی کا لقب کہہ لیجیے، اس میں خود بے

حقارت پائی جاتی ہے۔ مثلاً آج کل نا اہل کو خلیفہ، جاہل کو علامہ، اناڑی کو اُستاد

جی، اور عطائی کو شفاء الملک کہتے ہیں"۔

آپ نے کبھی اپنے ماضی پر غور کیا ہے؟

"جی ہاں، ہر شخص کبھی نہ کبھی اپنے ماضی پر ضرور سوچتا ہے، لیکن اس پر

پچھتانا فضول ہے، ہمیں زندگی کے سبق اس وقت ملتے ہیں، جب وہ ہمارے

لیے بیکار ہو چکتے ہیں، ان گمشدہ دنوں کے لئے تلملانا بے سُود ہے۔ ماضی اور

حال میں چنداں فرق نہیں، محض احوال وظروف ہی بدلتے ہیں، جہاں تک اسباب

ونتائج کا تعلق ہے وہ ہمیشہ ایک ظاہری فرق کے ساتھ یکساں رہتے ہیں

صدیوں پرانے انسان میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ اُس نے وقت

فاصلہ، اور زمین کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے، اس کی تبدیلیاں جسم کی ہیں

روح کی نہیں، اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف "میک اپ" کا ہے، زندگی یا تو

مشینی ہو گئی ہے یا کاروباری، باقی نفع وضرر کی خصوصیتیں پرانی ہی ہیں"۔

—— وزیر کی ان باتوں نے ہم سب کو متاثر کیا، گو اس کے الفاظ تنے پیوست نہ تھے لیکن اس کی باتوں کا مفہوم اس سے بھی زیادہ واضح تھا۔

" آپ نے کچھ پڑھا بھی ہے؟" قاضی نے پوچھا۔

" اگر پڑھنے سے مراد کتابیں ہیں، تو سمجھیے کہ حرف اُٹھانے کی مشق ہے لیکن بے شمار انسان ضرور پڑھے ہیں، سیکڑوں انسان! دادی اماں کی کھوٹ کا زمانہ دیکھا، ماں کی جوانی کا دور دیکھا، پھر خود ایک دور بِتا کر یہاں تک پہنچی ہوں، بیٹی کا کردوفر بھی دیکھا ہے، اور پوتیاں بھی آنکھوں کے سامنے چوکڑی بھر رہی ہیں، گویا پانچویں پشت سے انسان پڑھ رہی ہوں، مگر معاف کیجئے، مرد کا عشق محض دھوپ کا تڑاقا ہے۔"

" اور عورت کا عشق؟ خواجہ نے سوال کیا

" عورت کا عشق، ممکن ہے آپ کوئی پھبتی کسنا چاہیں، لیکن یہ کبھی نہ بھولئے کہ عورت محض جذبات پر جیتی ہے۔ وہ زندگی میں ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے بار بار نہیں، اگر اس کی محبت اُس سے دغا کرے، تو پھر وہ محبت نہیں کرتی، انتقام لیتی ہے؟

اور کسبی؟ قاضی نے دریافت کیا

وزیر کا چہرہ کسبی کے لفظ سے دمک اُٹھا —— اور گونجدار آواز میں کہا، کسبی —— ! کسبی، مردوں کی نسطائیت کے خلاف ایک احتجاج ہے؟"

"احتجاج یا انتقام"۔

"کچھ کہہ لیجئے، لیکن الفاظ بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی"۔

"اگر آپ کی رائے تسلیم کر لی جائے تو یہ احتجاج یا انتقام خود عورت ذات کے لئے ہتک کا موجب ہے"۔

امتیاز نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا "اذیت ناک ہے؟ کیا اپنی عصمت کو بیچنے کا نام انتقام یا احتجاج ہے؟"

ممتاز نے کہا، "آپ کیا رام کہانی لے بیٹھے ہیں، اس ٹھکا فضیحتی پر صلواۃ بھیجیے"۔

"ملاحظہ فرمائیے، یہ الفاظ کا تنزل ہے۔ آپ ہیں کہ عورت کے تنزل پر ہلکان ہو رہے ہیں، کہاں رام کہانی؟ اور کہاں صلواۃ؟ اور کہاں یہ مبتذل مفہوم؟"

قاضی نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا —— اور ممتاز لقمہ دیتے ہوئے بولی۔

"اس قسم کے تو کئی الفاظ ہیں، مثلاً لن ترانی ہے، اب ڈینگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی نے کبھی "یارِ غار" پر غور نہیں کیا، کہ اس کی خصوصیت کیا ہے؟ غالب نے غلط نہیں کہا تھا — ع

"غلطہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اب رات کا نصف قریب تھا، جو لوگ اہلِ علم تھے وہ چہرے چاٹتے ہوئے جا چکے تھے، کچھ اللو پنچو اِدھر اُدھر تاکتے جھانکتے گذر رہے تھے، بعض کن رسیے پناہیں چاہ رہے تھے، کہیں کہیں چوباروں میں آواز کی قرنا چھونکی جا رہی تھی، اور کئی شراب میں بدمست واہی تباہی بکتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

تقریب شروع ہو گئی۔ الہی کے بیٹے کا شگن تھا لیکن منچلوں نے اس کو بھی "یوم اقبال" سے تعبیر کیا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ تھے، ان پر "خان زادے" اور ان کے احباب خرد کش تھے۔ دوسری طرف عام مدعوین قالینوں پر کھلے بیٹھے تھے، ایک کونے میں استاد جی حاشیہ لگانے میں مشغول تھے۔ اور اُدھر سامنے کے رخ پر طوائفیں بیٹھی تھیں اُن کے دمکتے ہوئے چہروں کی یکجائی پر دیپ مالا کا قیاس ہوتا تھا۔ اور یہ کوئی پچاس کے قریب طوائفیں تھیں، لیکن ایک کا لباس دوسرے پر بازی لے گیا تھا، جن کا سن بیت چکا تھا وہ بھی چکارا نظر آتی تھیں، ان کو دیکھتے ہی یقین ہوتا تھا کہ یہ عورتیں نہیں سونا ہیں، ہمارا ملک زرعی نہیں زری ہے۔ ہم کسی متمول ملک کے باشندے ہیں، یہاں کوئی بھوکا ہے نہ ننگا۔ ہر کہیں رزق اور روپے کی فراوانی ہے، کوئی شخص خون نہیں پیتا، سب شراب پیتے ہیں۔

ممتاز جو اپنی ہمجولیوں میں (**Correction Slip**)بنی

بیٹھی تھی، ہمارے پاس بالکونی میں آگئی اور بتایا ——— " وہ صاحب
جن کے سیاہ چہرے پر برص کی دھاریاں پھیلی ہوئی ہیں، پہلے فریدہ کو گوانا
چاہتے ہیں "

" یہ کون بزرگ ہیں ؟ "

" بزرگ کہاں ہیں، برخوردار ہیں! ماں کی گود سے قسمت کے دھنی ہیں
پاکستان راس آگیا ہے۔ چہرے سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی
بچے نے سلیٹ پر چاک سے لکیریں کھینچ دی ہیں "

" جی نہیں، فریدہ سے پوچھئے، ان کے میاں ہیں، وہ کہا کرتی ہے۔
" آبنوس پر ہاتھی دانت کا کام ہے "

" اچھا ان میں کون کون اچھی گویا ہے ؟ "

" آپا مختار، اور آپا شمشاد "

" لیکن وہ تو ڈھل چکی ہیں "

" عمر کی بات اور ہے، لیکن آواز تو اب بھی جوان ہے، سچ پوچھئے
تو یہ دونوں صدا ہیں اور باقی جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں وہ بازگشت ہے "

• • •

فریدہ نے بول اٹھایا ~

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ایک گوشہ سے آواز آئی،" اس حسن اعتراف کا شکریہ :——

جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا۔

سو روپیہ کا نوٹ، ایک نوٹ، دو نوٹ، کئی نوٹ، ایک نے دس روپے کا نوٹ دکھایا، لیکن اس نے آنکھیں پھیر لیں، دو نوٹ، پہلو بدل لیا، تین نوٹ، پیٹھ کر لی —— وہ بھی منچلا تھا، دس دس کے دس نوٹ طاؤس کے پروں کی طرح پھیلا دیے —— فریدہ نے مسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے کہا، آج کل مندا ہے جیب ہی میں رکھ لیجیے، اس نے اس طعن کو گالی سمجھا، جیب سے مرخوں کی تھیلی نکالی، اور پاؤں میں بکھیر دی —— نوٹ ہی نوٹ!

بینک دولت پاکستان

—— حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا

دس روپیہ

زاہد حسین گورنر بینک دولت پاکستان	میں وعدہ کرتا ہوں کہ حامل ہذا کو جس وقت وہ چاہے عندالطلب مبلغ دس روپے ادا کر دونگا۔

اب فریدہ نے گھنگھرو باندھ لئے، اُس کی آواز کا لہرا ہوا کے بازوؤں پر لہرا رہا تھا۔ ایک غزل کے بعد دوسری غزل ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی ــــــــــــ

تیسرا نہیں ہوتا ـــــــــ ایک نوجوان نے درمیان میں سے کاٹ ڈالا، اور فریدہ نے رُخ پلٹا، ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

اور اُس کی آواز میں ایک گداز تھا ــــــــــــ

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

اُس کا اس مصرع کو پلٹ کر دہرانا تاثر کی تھاہ تک پہنچ چکا تھا، اور پھر مصرع اولیٰ کے نصف اول ـــــ وہی میری کم نصیبی ـــــ کو جس انتہا پر لے جا کر جس آہستگی سے لوٹایا، اس میں ایک ایسا گداز تھا کہ سامع ایک دوسری دنیا میں پہنچ چکے تھے ؎

چہ راہ می زند ایں مطرب مقام شناس

کہ در میان غزل قول آشنا آورد

اُس نے رقص ہی رقص میں کئی حکایتیں کہہ ڈالیں، کبھی بانسری چھیڑی،

کبھی قرنا پھونکی، کبھی سہیلیوں کا جھومر آراستہ کیا، کبھی سہاگن کا نقشہ باندھا، کبھی بیراگن کی تصویر کھینچی، کبھی ستاروں تک پہنچی، کبھی آفتاب کو اتار لائی، کبھی میکدے کو اُجالا، کبھی ساون کی پینگیں بڑھائیں، کبھی تعاقب کیا، کبھی انتظار میں کھو گئی، کبھی خیر مقدم کیا، القصہ زاویوں کی زبان میں اس نے کئی دفتر لکھ ڈالے،

اُس کے جسم کا ایک ایک ٹانکہ بول رہا تھا، اس کی پلکوں کے تناؤ میں کئی گھاؤ تھے، اور کوئی جوہر مفقود تھا، تو وہ نسائیت کا جوہر تھا۔

• • •

فردوس نے پہلے تو حاضرین کا جائزہ لیا، اور پھر "ابھی تو میں جوان ہوں" گانا چاہا، لیکن حاضرین نے اصرار کیا ——— اقبال

تیور بدلے، اور پھر زاویہ بناتے ہوئے فردوس نے ———

بول اٹھایا ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

اس کی آواز میں کندن کی سی دمک نہ ہونے کے باوجود آواز کا چکمہ ضرور تھا، اُس نے ہر شعر معذرت کے لہجہ میں گایا اور ہر نوٹ تشکر کے ساتھ وصول کیا، لیکن اس کے اعضاء کی لچک سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان ٹہنیوں کی

اَب مر چکی ہے، اگر کوئی شے باقی ہے تو وہ ایک خوبصورت خول ہے جس میں شب بسریوں کے بہت سے جوڑ ہیں۔

عنایت بائی ڈھیرو والی نے غزل چھیڑی ؎

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اور جب محفل مطلع سے مقطع پر پہنچی تو رنگ ہی دگرگوں تھا ؎

عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

آواز میں جادو تھا اور غزل نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، مطلع تھا ؎

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

مقطع تھا ؎

کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

عنایت نے صوفہ نشینوں کے گریبانوں پر حنائی انگلیوں کا نشانہ باندھا اور پھر مصرع اولیٰ کو پلٹتے ہوئے قدرے لوچدار آواز میں —— کیا صُوفی و ملّا کو —— اور قدرے گونجدار آواز میں —— خبر میرے جنُوں کی

دہرایا، تو اس ادا پر محفل کی محفل نثار ہو گئی، اِدھر اُدھر سے نوٹوں کی برکھا ہونے لگی، ایک بالا بلند نوجوان نے گریبان پھاڑ ڈالا، اس پر سو سو روپے کے کئی نوٹ رکھ کر نذر کئے اور کہا ہاں ذرا ایک دفعہ پھر:———

کیا صوفی و مُلا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

ممتاز نے بھی اقبال ہی سے شروع کیا:۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

یہ شعر مدعوین کی ذہنی استعداد سے بہت بالا تھے، لیکن عبدالحمید عدم کی ایک غزل سے اس کی دھاک بیٹھ گئی، چونکہ فنی ہے، لہذا آواز کا جوار بھاٹا سہ آتشہ ہو گیا تھا۔

زندگی کے اداس لمحوں میں
بے وفا دوست یاد آتے ہیں
خوش رہو اے حسین انسانو
راستے جگمگائے جاتے ہیں

اُدھر راہوارِ شب سرپٹ دوڑ رہا تھا، لیکن رنڈیوں کے قہقہے، اور سگریٹوں کا دھواں اس سے بھی تیز تھے، ممتاز گا چکی، تو ایک کونے سے آواز آئی، مختار

مختار نے سگریٹ کا بھرپور کش کھینچتے ہوئے آواز کا تعاقب کیا، کچھ نوجوانوں نے فرمائش کی تو اس کا چہرہ کھلکھلا اٹھا، گویا سراپا تشکر ہے، پہلے آواز کو پکے راگ سے کھنگالا، پھر حشر کی غزل گائی

چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی
خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اس کی آواز میں ابھی تک صبح جوانی کا نور ہے، لیکن زندگی شام غریباں تک آپہنچی ہے، ایک طوائف اس وقت بیوہ ہو جاتی ہے جب جوانی بیت چکی ہے، اور یہ احساس مختار کی آواز سے بھی جھلک رہا تھا، وہ جانتی ہے کہ اب وہ ایک آواز ہے جس کی لذت محض کانوں کے لئے ہے اور اس کا بدن پان کا تنہ ہے جو پک چکا ہے، اور اس پر بھی "عقد مسنونہ" کی مہر لگ گئی ہے۔

ایک عورت کے لئے اس سے بڑھ کر صدمہ کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بوڑھی ہو چکی ہے، یا اس کا حسن مر چکا ہے، عورت ہمیشہ عمر کی زیادتی سے گھبراتی ہے، جو عورت اپنی صحیح عمر بتا دے، سمجھئے کہ وہ اپنی غلطیوں میں کوئی دلکشی پیدا نہیں کر سکتی، اور پھر ایک طوائف، جو آہ بن کر اٹھتی اور آنسو بن کر گرتی ہے۔

شمشاد نے (جس کی عمر اب ڈھل چکی ہے) پہلے تو عذر چاہا، لیکن ہجولیوں کے اصرار پر راضی ہو گئی۔

قیوم نظر کی غزل سے

زندگی چال چل گئی شاید
موت بھی آکے ٹل گئی شاید

اور پھر ——— اقبال

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

محسوس ہو رہا تھا جیسے آواز میں جوانی گا رہی ہے، لیکن اُس کے چہرے کے شہابی رنگ پر یہ سوال پھیلا ہوا تھا کہ زندگی بڑھاپے سے شروع ہو کر بچپن پر ختم ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

اس کی آواز اور وقت دونوں اُڑے جا رہے تھے، اور اب تو فضا کا رنگ ہی بدل گیا تھا، صوفہ نشینوں کی وضعداریاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں، پیالوں کے سُرخ پانی نے حواس کا توازن ہلا دیا تھا۔

ایک عجیب و غریب شور میں شہناز نے ناچنا شروع کیا۔ کلائی سے کلائی پر گرہ باندھی، ایڑیاں ٹھمکائیں، آواز آئی ——— "پنجابی"

بڑے اچھے ہاتھ پاؤں کا ایک جامہ زیب نوجوان سامنے آ بیٹھا، غور سے دیکھا، اچکن کی جیبیں ٹٹولیں۔ دو بنڑے پاؤں پر نچھاور کئے اور کہا شہناز پنجابی! ——— دل تیرے پیار دیاں پاندا اے کہانیاں

شہناز نے دور آئینہ پر ایک نظر ڈالی ——— ع

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اس کی لم چھڑی آنکھوں میں ان کہے خیالوں کی تتلیاں جھلملا رہی تھیں، اِدھر دائرہ بنا، اُدھر ہاتھوں کے گجرے حرکت میں آ گئے، بوٹی بوٹی تھرکنے لگی، ایک توس کہ جس پر نام کی کوئی تہمت بھی دھری نہیں جا سکتی اور اس کا رقص رات کے گھنے پن میں اور بھی گھنا ہو گیا، نہ دیئے ہی نہ دیئے ——— دائرے ہی دائرے ہے

دل وِچ درد اے، تے اکھاں وِچ اتھرو

سانبھ سانبھ رکھیاں نے تیریاں نشانیاں ———

دل تیرے پیار دیاں پاندا اے کہانیاں

(دل میں درد ہے، اور آنکھوں میں آنسو، اے محبوب! میں نے تیرے پیار کی نشانیاں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑی ہیں، اس لیے کہ دل تیرے پیار کی کہانیاں کہتا ہے)

اُس کا ناچ تیز ہوتا گیا، اس کی دھنیں پھیلتی گئیں، اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا، اس کی ادائیں نکھرتی گئیں، اس کے پھول کھلتے گئے، اس کے شعلے ٹوٹتے گئے، اس کا روپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا، کبھی لہروں کی طرح بڑھی، کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی، کبھی خوشبو کی طرح پھیلی، کبھی بجلی کی طرح کوندی،

کبھی مینا کی طرح چھلکی، کبھی ساغر کی طرح کھنکی، کبھی گلاب کی طرح مہکی،
کبھی بلبل کی طرح چہکی، کبھی گھٹاؤں کی طرح اُٹھی، کبھی میکدے کو نکل گئی، کبھی
تبکدے کو آ گئی، کبھی آغوش بن گئی، کبھی امنگوں میں گھلنے لگی، اور کبھی
رنگوں کا پیکر بن گئی ——— لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی، اس کا ہر زاویہ
سوال بنتا گیا ——— فرشتوں کا زہر خند ——— قدرت کا نوحہ

وہ ناچ رہی تھی، ہم دیکھ رہے تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے وہ ناچ رہی تھی
——— وقت ناچ رہا تھا، ماحول ناچ رہا تھا، دل ناچ رہے تھے۔
دماغ ناچ رہا تھا، در و دیوار ناچ رہے تھے، چشم و گوش ناچ رہے تھے، الغرض
فضا میں ناچ ہی ناچ تھا، لیکن یہ ناچ ——— بکاؤ ناچ ——— سیاست
کے ناچ سے کہیں بہتر ناچ تھا، سیاست کے ناچ میں کئی چیزیں ناچتی ہیں، قوم ناچتی
ہے، ملک ناچتے ہیں، غیرت ناچتی ہے، حمیت ناچتی ہے، عقیدے ناچتے
ہیں، اور ابھی پانچ سال پہلے ہزار ہا عصمتیں ناچ چکی ہیں۔

اور یہ ناچ صرف جسم کا ناچ تھا، بیوپار کا ناچ، لین دین کا ناچ، مرد کی
جیب اور عورت کے جسم کا ناچ، جس کے ساتھ ضرب تقسیم اور جمع تفریق کا کوئی
کاشانہ تھا ———

——— دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

رات کا سناٹا ختم ہونے کو تھا اور ستاروں کے قافلے خلاؤں میں ڈوب

جانے کو مدھم ہو چکے تھے، شہناز کا جسم تھک چکا تھا، لیکن اقبال نے آواز کو سہارا دے رکھا تھا ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

اور ـــــــ

ـــــــ اب بھنگڑہ (پنجابی لوک ناچ) شروع ہو چکا تھا، گھنگھروں کے چھناکے، ستار کے لہرے، طبلے کی دھمک تھپک، ـــــــ اور پھر ـــــــ ستلج کے گیت، بیاس کے بول، راوی کے راگ، چناب کا ماہیا، اور جہلم کے دوہے،

اڑا اڑا دھم، بھنگڑا ـــــــ اڑا اڑا دھم، بھنگڑا
تا تھیا، تا تھیا، تا تھیا ـــــــ اڑا اڑا دھم، بھنگڑا
اڑا اڑا دھم، بھنگڑا ـــــــ تا تھیا، تا تھیا، تا تھیا

؎ ترن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی
سلفے دی لاٹ ورگی

(دوشیزہ جوہڑ میں سے نہا کر نکلی تو محسوس ہوا کہ عورت نہیں سلفہ کا شعلہ جو الا ہے۔)

"مینوں پنڈ دی کڑی نہ سمجھیں دے دساں تینوں ترن بن کے

(مجھے گاؤں کی لڑکی نہ سمجھنا، میں عورت بن کر بھی دکھا سکتی ہوں"
یہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور عورتوں کے بانکپن کی طرف
اشارہ ہے)

ے میری لگدی کسے نہ ویکھی
تے ٹٹدی نوں جگ جاندا

(جب میں نے پیار کیا تو سب بے خبر تھے، لیکن جب پیار
ٹوٹا تو دنیا جانتی ہے)

ے اگ بال کے دھوئیں دے پج روواں
تے بڑے دکھ یاریاں دے

(میں آگ جلا کر دھوئیں کی آڑ میں رو لیتی ہوں، کیسے کہوں کہ عشق
و عاشقی کے روگ کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں)

ے میرا یار نی سرو دا بوٹا
تے وہڑے وچ لا رکھدی

(میرا چہیتا سرو کا بوٹا ہے۔ کاش میں اسے اپنے
صحن میں لگا سکتی۔

ے ڈٹری واسک کل کے
منڈا موہ لیا تویتاں والا

(ایک کوڑی کا ہونٹوں پر دنداسہ مَل کر تعویذوں والا لڑکا شکار کر لیا ہے ——— پنجاب میں رواج ہے کہ مائیں اپنے بیٹوں کو نظرِ بد سے بچانے کے خیال سے تعویذ پہنا دیتی ہیں۔)

ے ماجھے دیئے بند بوتلے
تینوں پین گے نصیباں والے

(شاعر محبوبہ سے کہتا ہے، اے ماجھے (فیروز پور اور امرتسر کا علاقہ جو خود کشیدہ شراب کے لئے مشہور تھا) کی بند بوتل (دوشیزہ) تجھے مقدر والے ہی پئیں گے)

ے تیرے لونگ دا پیا لشکارا
تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

(اے محبوبہ! تیرے ناک کی کیل کے چمکارے پر کسانوں نے ہل روک لئے ہیں ——— یعنی بجلی چمکی ہے۔ بادل آ رہے ہیں اور برکھا ہونے والی ہے)

اڑا دھم، اڑا دھم، اڑا دھم بھنگڑہ
اڑا دھم، اڑا دھم، اڑا دھم بھنگڑہ

——— آخر رات بیت گئی۔ مجرا ختم ہو گیا۔ اب فرشِ زمین پر یا تو موتیے کے آزردہ پھول تھے اور یا ابریشمی ساڑھیوں کے شکستہ بالے،

یا بوجھل پلکوں پر نیند کی دبیز تہیں، جنہیں عالمگیری مسجد کے پرشکوہ میناروں پر بلالؓ کا وارث جھنجوڑنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــــ

حی علی الصلوٰۃ ـــــــ حی علی الصلوٰۃ

حی علی الفلاح ـــــــ حی علی الفلاح

الصلوٰۃ خیر من النوم

الصلوٰۃ خیر من النوم

اللہ اکبر ـــــــ اللہ اکبر

لا الٰہ الا اللہ

حرفِ آخر

- اس کتاب کی تصویریں کچھ تو میری کھینچی ہوئی ہیں، کچھ میرے دوستوں نے حاصل کی ہیں اور کچھ بعض جرائد سے اخذ کی گئی ہیں ——— انہیں فاضل آرٹسٹ حفیظ سرور نے ترتیب دیا ہے۔ اور سرورق بھی انہیں کا تیار کیا ہوا ہے۔
- چونکہ کسی کی تشہیر مقصود نہیں، اس لئے نام حذف کر دیے گئے ہیں، ہاں اُن اسماء کو ضرور ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے، جن سے موضوع کی وضاحت ہوتی ہے۔
- جہاں تک زبان کا تعلق ہے حتی الامکان اس کے حدود کا احترام کیا ہے، البتہ بعض محاورات جن کا تعلق پیشے سے ہے اور جو مقامی طور پر رائج ہیں، انہیں جُوں کا تُوں رہنے دیا ہے، اور میں بعض پنجابی محاوروں کے استعمال کو جائز سمجھتا ہوں۔
- "ٹکہائی" کی املا بعض جگہ "ٹکیائی" لکھی گئی ہے جو مختلف کتابوں میں مختلف ہے۔ اپنے علم کے مطابق درست کر لیجیے۔
- جن مصنفوں کی تحریرات سے اس کتاب میں مدد حاصل کی ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔

• نیاز فتحپوری (ترغیباتِ جنسی و نگار)، • ابوالکلام (الہلال و غبارِ خاطر)، • ابوالاعلیٰ مودودی (پردہ)، • عبدالحلیم شرر (مضامینِ شرر)، • محمد افضل خاں (تفصیل موسیقی)، • عبدالرزاق کانپوری (یادِ ایام)۔ ان کے علاوہ کچھ انگریزی مصنفوں کی کتابیں ہیں جن میں "تاریخ الفحشا" (History of Prosritituation) بڑی ہی معلوماتی کتاب ہے۔ اور بعض مصنف مثلاً ڈبلو ایکسن فارنان، سوجیٹ، ڈبلیو فشر وغیرہ۔